صلصال

احمد شناس



محترم جناب سلیم سالک
صاحب کی نذر
بصد خلوص
احمد شناس
۱۵ /8 /۱۶

'صلصال'

غزلوں اور نظموں کا مجموعہ

احمد شناس

صلصال

غاروں کا سفر ہے کہ مکمل نہیں ہوتا
میں اپنی خبر آپ ہی ڈھونے کیلئے ہوں

احمد شناس



رہبر بک سروس
(پرنٹر، پبلشر اینڈ ڈسٹری بیوٹر)
پوسٹ باکس نمبر:9736، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی-110025

اس سے پھلے

مصنف کا شعری مجموعه

'پسِ آشکار'

منظرِ عام پر آچکا ھے

ملنے کا پته:

SPEC

(The Society for Peace and Environmental Concerns)

سوسائٹی فار پیس اینڈ اینوائیرنمنٹل کنسرنز

26-E-Tawi Vihar Colony Sidhra

Jammu(J&K) Pin 180019

Contact : 8803500711

Email: Shanas_Jmu@yahoo.com

انتساب

ادب کے ذہین اور سنجیدہ طالب علم کے نام

—— کہ وہ ——

☆ آجکی Consumer Society میں رہتے ہوئے مادّی ضرورتوں سے زیادہ انسان کی معنوی ضرورتوں کو اہمیت دیتا ہے۔

☆ شعروادب کو اعلیٰ انسانی قدروں کی بقا کا وسیلہ سمجھتا ہے۔

☆ اظہار و بیاں کے گلستاں میں رنگ و آہنگ کے نئے پیکر دریافت کرنا چاہتا ہے۔

☆ طے شدہ نظریات کی دنیا میں اپنی آزاد رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور

☆ چیزوں کو بالکل ویسی ہی دیکھنا چاہتا ہے جیسی کہ وہ ہیں۔

انتساب

ادب کے ذہین اور سنجیدہ طالب علم کے نام

—— کہ وہ ——

☆ آجکی Consumer Society میں رہتے ہوئے مادّی ضرورتوں سے زیادہ انسان کی معنوی ضرورتوں کو اہمیت دیتا ہے۔

☆ شعر و ادب کو اعلیٰ انسانی قدروں کی بقا کا وسیلہ سمجھتا ہے۔

☆ اظہار و بیاں کے گلستاں میں رنگ و آہنگ کے نئے پیکر دریافت کرنا چاہتا ہے۔

☆ طے شدہ نظریات کی دنیا میں اپنی آزاد رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور

☆ چیزوں کو بالکل ویسی ہی دیکھنا چاہتا ہے جیسی کہ وہ ہیں۔

ISBN 978-81-924019-1-1

نام کتاب : صَلصال

موضوع : شاعری

شاعر : احمد شناس

سنِ اشاعت : ۲۰۱۳ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۳۵۰ روپے

کمپیوٹر کمپوزنگ : بھاو کا گرافِکس، بُوٹا نگر پلوڑہ، جمّوں

ناشر : رہبر بک سروس (پرنٹر، پبلشر اینڈ ڈسٹری بیوٹر)

پوسٹ باکس نمبر:9736، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی 110025-

کتاب ملنے کا پتہ : سوسائٹی فار پیس اینڈ اینوائیرنمنٹل کنسرنز

۲۶/ای توی وہار کالونی۔ سدھرا، جموں۔۱۸۰۰۱۹ جموں وکشمیر

Published By



RAHBAR BOOK SERVICE

Printer,Publishers&Distributor

Post Box:9736,Jamia Nagar,New Delhi-110025(India)

Mobile:+ 91-9810862382, E-mail:rahbarbookservice@ gmail.com

SALSAL(Poetry)

By ***Ahmed Shanas***

2013

Rs.350/ $10

میزان

اھتمام:

SPEC

(The Society for Peace and Environmental Concerns)

سوسائٹی فار پیس اینڈ اینوائیرنمنٹل کنسرنز

۲۶/ای توی وہار کالونی۔ سدھرا، جموں۔۱۸۰۰۱۹ جموں وکشمیر

SPEC

26-E-Tawi Vihar Colony Sidhra

Jammu(J&K) Pin 180019

Contact : 8803500711

Email: Shanas_Jmu@yahoo.com

احمد شناس، 'صَلصال': اور بصیرتوں کا چراغاں

پروفیسر قدوس جاوید

زبان کی گیلی مٹی کا ایسا تخلیقی برتاو کہ لفظ وجود کے 'صَلصال' ہونے کی گواہی دے شاعر سے ''پس وپیش آشکار'' آدم خاکی کے حدود وامکانات کا پورا شعور چاہتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ شاعری۔ عمدہ شاعری جب ظہور پزیر ہوتی ہے تو صرف اور محض شاعری نہیں ہوتی، شاعری سے ماورا بھی ''بہت کچھ ہوتی ہے۔ اس ''بہت کچھ'' سے ہی شاعر اور اس کی شاعری کی آواز کا انفراد وامتیاز قائم ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے احمد شناس کے تازہ ترین شعری مجموعہ ''صَلصال'' کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ احمد شناس کی شاعری۔ شاعری ہونے کے ساتھ ساتھ ''صَلصالِ وجود'' کی معنویت کی جستجو سے بھی عبارت ہے۔

دراصل اس جہانِ رنگ وبو میں انسانی وجود ایک 'صَلصال' کا ہی حکم رکھتا ہے۔ انسان کے افکار واعمال کی صداؤں میں ہی اس کائنات کی ترنم ریزی، آشفتہ سری اور مسئلہ خیزی کے تمام اسرار مضمر ہیں بلکہ دیکھا جائے تو انسان اپنی سرشت میں ایک 'صَلصال' ہی ہے۔ کتاب الفُرقان میں درج ہے۔

خَلَقَ الانسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کالْفَخَّار

(اللہ نے انسان کو بنایا بجتی مٹی سے)

(پارہ ۲۷۔ سورہ رحمن، آیت ۱۴)

عرفان وادارک کی یہی وہ منزل ہے جس نے احمد شناس کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ:

زمین کے اظہار رنگ و بو میں شرار مٹی کا بولتا ہے
نگار وحرف و نوا کی صورت خمار مٹی کا بولتا ہے
اسی کی چاہت اسی کی حسرت پروں سے لپٹی ہوئی ہے میرے
اُڑان بھرنے لگوں تو گرد و غبار مٹی کا بولتا ہے

'صَلصال' احمد شناس کے اولین شعری مجموعہ ''پس آشکار'' کی شعری ولسانی توسیع ہے فرق یہ ہے کہ پس آشکار میں شاعر سلوک کے پہلے مرحلے حیرت واستعجاب تک پہنچ کر وجودِ آدمِ خاکی کی بے بضاعتی، خالی پن اور صِفریت۔ پر اصرار کرتا نظر آتا ہے:

پسِ خیال ہوں کتنا، ظہور ہوں کتنا
خبر نہیں کہ ابھی خود سے دور ہوں کتنا

.......☆.......

ریزہ ریزہ اعتبارِ جسم وجاں ہوجائے گا
ایک دن یہ واقعہ وہم وگماں ہوجائے گا

.......☆.......

سنا تھا تجھ سے اپنا نام تو ''شہکار'' میں نے
''زمیں کا بوجھ'' لکھا خود کو آخر کار میں نے

لیکن جذبۂ جستجو کی جڑیں، ایمانی وایقانی شعور میں پیوست ہوں تو سالک، وجودِ حقیقی کے عرفان وادراک کی جانب جیسے جیسے قدم آگے بڑھاتا جاتا ہے اس پر اپنے وجودِ خاکی کے اسرار بھی کھلتے جاتے ہیں۔ احمد شناس ''پس آشکار'' میں ہی اس مرحلہ شوق کے قریب چہل قدمی کرتے نظر آتے ہیں۔

کسی کو حامل 'اِقرا' قرار دیتا ہے
کسی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے
جہاں جہاں میرا وہم وگماں نہیں جاتا
وہاں وہاں سے وہ سورج نکال دیتا ہے

'صَلصال' میں شاعر اُس ''بیکراں ذات'' سے وابستگی کو ہی اپنے وجود کے عرفان کا وسیلہ بنانے پر اصرار کرتا نظر آتا ہے۔

کچھ تو میرے وجود کا حصہ ہے تیرے پاس
ورنہ میں اپنے آپ میں کیوں انتظار ہوں

.......☆.......

خود کو پایا تھا۔ نہ کھویا میں نے
بیکراں ذات کنارا تھا مجھے

......☆......

یقین دشت سے پھوٹے گا آبجو کی طرح
کہ حرفِ 'لا' کی گواہی بحال کر دیکھو

......☆......

کیسے کھڑا ہوں کس کے سہارے کھڑا ہوں میں
اپنا یقین ہوں کہ تیرا اعتبار ہوں

......☆......

شب وروز نخلِ وجود کو نیا، ایک برگِ انا دیا
ہمیں انحراف کا حوصلہ بھی دیا تو مثلِ دُعا دیا

’’صَلصال‘‘ ’’احمد شناس کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ غزلیں زیادہ ہیں نظمیں چند ایک ہیں لیکن انتخابِ ’صَلصال‘ کی غزلیں، سادہ اور لطیف روحانیت اور پر آشوب عصری سماجی وثقافتی صورت حال کے حوالے سے انسان کو سیاسی انتشار، مذہب کی جاہلانہ توضیح، ایمانی وایقانی زوال اور وجودی بحران کے جبر سے نبرد آزما ہونے کا شعور جگاتی ہیں۔ ’’جزو‘‘ کے ’’کُل‘‘ کے ساتھ نادیدہ لیکن ناگزیر رشتوں سے منور احمد شناس کی غزلیں، غزل کی شعریات میں سنجیدہ اور تقدس مآب زاویوں کا اضافہ کرتی ہیں۔ کیونکہ ان غزلوں سے ’’شعور جسم‘‘ (Body Consciousness) کی نہیں بلکہ ’’شعور روح‘‘ (Soul Consciousness) کی صدائیں آتی ہیں۔ حکایات آدم کے نقطہ آغاز میں ہی جب آدم اور حوا کا ’’شعور جسم‘‘ بیدار ہوا تھا تو اس کا نتیجہ ہبوط آدم، (یعنی آسمانوں سے آدم اور حوا کے اخراج کی صورت میں سامنے آیا تھا)۔ تب سے انسان زمین پر اپنے وجود کی معنویت کی جستجو میں سرگرداں ہے۔ آج بھی انسان جسم کے تقاضوں کا اسیر ہے۔ اور کچھ اس شدت کے ساتھ کہ پورا معاشرہ جیسے ’’گوشت کے سمندر‘‘ میں تبدیل ہوگیا ہو۔ جہاں صرف جسم ہی جسم اور جسم کے تقاضوں کی بے لگام اندھی لہریں ہیں، لیکن زندگی کے ضابطے ایمانی واخلاقی قدروں کی شمعوں سے روشن ہوں تو اس بیدارئ جسم کا احساس واظہار بھی تعمیری صورت میں سامنے آتا ہے۔

محبتوں کو کہیں اور پال کر دیکھو
متاعِ جاں کو بدن سے نکال کر دیکھو

......☆......

بدل کے دیکھو کبھی نسبتوں کی دنیا کو
بدن کو روح کے خانے میں ڈال کر دیکھو

......☆......

جسم کے سارے تقاضے ہیں ادھورے احمدؔ
یہ تصور کبھی بھر پور نہیں ہو سکتا

.......☆.......

بدن کی پیاس بھی اک ماورا کہانی ہے
ہر ایک بوند کو دریا خیال کر دیکھو

اور پھر جسم و جاں کی حقیقت اور حیثیت کا اظہار کچھ اس انداز میں ہوا ہے۔

ہر بار یہ شیشے کا بدن ٹوٹ گیا ہے
ہر بار نئے ایک کھلونے کے لیے ہوں

.......☆.......

ہر ایک جسم یہاں روح کی علامت ہے
یہ ریگزار بھی نغمہ سنانے والا ہے

.......☆.......

جسم بھوکا ہے تو ہے روح بھی پیاسی میری
کام ایسا ہے کہ دن رات کا کارندہ ہوں

اگر دیکھا جائے تو احمد شناس کی اس نوع کی شاعری، انسان، انسانی معاشرہ اور ایمان وایقان کی حرارتوں کے ساتھ ساتھ جسم کی بلوغت باختگی سے بے نیاز ''شعور روح'' کے دروازے پر دستک دیتی شاعری ہے جو اپنی انتہائی فنی و جمالیاتی وحدت کی صورت میں تصوف کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔

'صَلصال' کی غزلیہ شاعری، ذات، زمیں، زمانہ اور خالقِ زمان و مکان کے ایک وحدت میں ڈھل کر مادی اور روحانی بصیرتوں کا چراغاں کرنے والی شاعری ہے۔

اور یہی 'صَلصال' کی غزلیہ شاعری کی شناخت، انفراد اور امتیاز ہے۔ احمد شناس کی غزلوں میں غزل کی شعریات کا احترام بھی ہے اور التزام بھی لیکن وہ اظہار و بیان کی کلاسیکی رسومیات کے برتاو سے انحراف بھی کرتے ہیں اور اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جدید غزل کی شعریات سے انحراف کا یہ عمل احمد شناس کے پہلے شعری مجموعے ''پس آشکار'' (۲۰۱۰) میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ اس وقت تک سوئیر، دریدا، رولاں بارتھ، رومن جیکب سن، باختین، لیوی اسٹراس اور لیوتار کے لسانی و ادبی نظریات کے زیر اثر مابعد جدیدیت کا ارتقا ہونے لگا تھا اور ادب کی سماجیت کے ساتھ ساتھ ادب کے ثقافتی کردار کی اہمیت بھی بڑھنے لگی تھی۔ برصغیر کی جدید زبانوں میں اُردو نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مابعد جدید ادبی تھیوری کے اثرات قبول کیے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بیسویں صدی کی آخری اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک آتے آتے غزل کی شعریات کی تشکیل جدید کا عمل بھی شروع ہو جاتا ہے۔ جس کے آثار ناصر کاظمی، شجاع خاور بانی، پروین کمار اشک، ظفر اقبال اور حکیم منظور وغیرہ کے یہاں نمایاں ہو چکے تھے لیکن جن نئے شاعروں نے اس عمل کو رفتار اور معیار عطا کی ان میں عرفان صدیقی، اسعد بدایونی، رفیق راز اور شفق سوپوری کے ساتھ ساتھ احمد شناس کا بھی ایک اہم کردار رہا ہے۔

خود فراموشی کے جنگل سے اٹھے گی — آ گہی بھی صبح صادق کی ہوا ہے

اب نغموں کے دیپک کون جلائے گا — اب بنجارے پکے گھر میں رہتے ہیں

باہر انسانوں سے نفرت ہے لیکن — گھر میں ڈھیروں بچے پیدا کرتے ہیں

ہے واہموں کا تماشا یہاں وہاں دیکھو
ہمارے پاس مکمل خدا کہاں دیکھو
پھٹا ہوا کسی عریاں سوال جیسا ہے
ہمارے سر پہ یہ رحمت کا سائباں دیکھو

احمد شناس کے یہاں ایسے ڈھیروں غزلیہ اشعار ملتے ہیں جنھیں مابعد جدید شاعری کے عمدہ نمونے کہہ سکتے ہیں۔ ان اشعار میں احمد شناس نے مابعد جدید معاصر سماجی وثقافتی، معاشی وسیاسی ڈسکورس کے حوالے سے اپنے تجربات ومشاہدات اور کیفیات وتاثرات کی لسانی تشکیل کی ہے احمد شناس نے تازہ کار مترنم اور معنی خیز الفاظ وتراکیب، تشبیہات واستعارات کے برتاؤ میں ایسی فن کارانہ مہارت کا مظاہرہ کیا ہے کہ ان کی غزلوں کے اکثر وبیشتر اشعار ذہن وضمیر میں فوراً اُتر جاتے ہیں اور عام طور پر غزل کے وہی اشعار کامیاب تصور کیے جاتے ہیں جو پڑھنے یا سننے کے بعد قاری یا سامع کی یاداشت کا حصہ بن جائیں۔ احمد شناس کے یہاں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں مثلاً۔

نوجوانوں کا قبیلہ اس کے پیچھے چل پڑا
جرم کر کے بھاگنے والا مثالی ہو گیا
ایک بچہ ذہن سے پیسہ کمانے کی مشین
دوسرا کمزور تھا سو، یرغمالی ہو گیا

......☆......

پلٹ کے آئیں گے ساون کے رنگ آنکھوں میں
تم اپنے آپ سے رشتہ بحال کر دیکھو

......☆......

یہ دنیا ایک لمحے کا تماشہ
نہ جانے دوسرا لمحہ کدھر ہے

......☆......

نام اپنا کسی دیوار پہ لکھ کر احمدؔ
میں سمجھتا ہوں ہمیشہ کے لیے کندہ ہوں

میں خود اپنے آپ سے ہوں بیگانہ سا
بستی کے انسان بھی میرے جیسے ہیں

.......☆.......

مذہب ہر انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ مگر مذہبی رویہ ہر انسان کا دوسرے انسان سے مختلف ہوتا ہے۔ اسلئے کہ رویوں کا تعلق فرد کے فہم وشعور سے ہوا کرتا ہے۔ مذہب کے ساتھ جذباتی وابستگی ایک چیز ہے۔ مگر جب ہم جذبات سے اوپر اٹھ کر اسے اپنے شعور کا حصہ بناتے ہیں تو پھر مذہب کی غرض وغایت اور انسانی زندگی میں اسکی اہمیت بھی سمجھ میں آنے لگتی ہے۔
'صَلصال' کا شاعر شعوری سطح پر خود کو مذہب کے ساتھ Relate کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ مذہب کو اسکے ڈھانچے یا اسکے Form کے حوالے سے نہیں بلکہ اسکی اصل یعنی اسکی روح کے حوالے سے دریافت کرتا ہے۔ اسلئے اسکے اشعار میں محدود سے لامحدود کی طرف سفر کے اشارے ملتے ہیں۔ وہ مذہب کے اندر معنوی اقدار کے فُقدان کا گہرا احساس رکھتا ہے۔ اسکے اشعار میں اسکا روحانی کرب صاف جھلکتا ہے۔ شدتِ احساس کی وجہ سے اکثر اسکا بیان تلخی آمیز ہو جاتا ہے۔
چند اشعار دیکھئے:۔

وہ اذانِ ذات کا اللہُ اکبر
اب کسی مسجد کا چھوٹا سا خدا ہے

.......☆.......

جہالت روگ تھا جو دل کے اندر
وہی مذہب ہمارا ہو گیا ہے

.......☆.......

میری سانسوں میں کہاں ہےورنہ وہ خوشبوئے جاں
ساری تقریریں ہیں محفل کی حرارت کیلئے

.......☆.......

وہ خدا کے واسطے بولا ہمیشہ
اسلئے مذہب سے خارج ہوگیا ہے

.......☆.......

احمد شناس کو معلوم ہے کہ غزل کی شعریات کو نئے رنگ میں برتنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کی غزل کی سابقہ شعریات کو یکسر رد کر دیا جائے کیونکہ سابقہ بنیادوں پر ہی نئے معیار کی مضبوط و مستحکم تعمیر ہوتی ہے۔ احمد شناس بھی اپنے کئی دہائیوں پر محیط تخلیقی عمل اور مطالعہ و مشاہدہ کی بنا پر یہ جانتے ہیں کہ معاشرتی اور ثقافتی لیل ونہار کے باعث ہر زبان اور صنف کی شعریات کے سابقہ معائر، جدید ترین معائر کے آگے سرنگوں ہوتے جاتے ہیں اور بسا اوقات سابقہ معائر اور اقدار کی باز آفرینی بھی کوئی نئی بات نہیں۔ مثال کے طور آج اُردو غزل کی شعریات صد فی صد وہ نہیں ہے جو فیض احمد فیض حسرت، مجاز اور جذبی کے زمانے کی شعریات تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے فیض، منیر نیازی اور ان کے معاصرین کی شعریات بھی وہ نہیں تھی جو اقبال، شاد عظیم آبادی اور فراق وغیرہ کے زمانے کی شعریات تھی۔ اسی طرح ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ کے یہاں میر و سودا کے عہد کی اُردو غزل کی شعریات کی باز آفرینی کے چرچے بھی عام رہے ہیں۔ بہر حال ''پس آشکار'' اور 'صَلصال' کی غزلیں بھی بحثیت مجموعی غزل کی نئی شعریات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی نظر آتی ہیں۔ اس اختصاص کے ساتھ کہ احمد شناس کی شاعری میں روحانیت یا تصوف کے عناصر کہیں ایمانی وایقانی جذبات کے ساتھ سامنے آتے ہیں تو کہیں عقیدت مندی اور قلبی نسبتوں کے ساتھ۔

اللہ والا ایک قبیلہ میری نسبت
اور میں اپنے نام، نسب سے ناواقف ہوں

.......☆.......

نسبتوں کے بے ثمر جنگل میں سرگرداں ہوں میں
نام احمد رکھ لیا حسنِ سماعت کے لیے

.......☆.......

میں نے بھی بچوں کو اپنی نسبت سے آزاد کیا
وہ بھی اپنے ہاتھوں سے انسان بنانا بھول گیا

.......☆.......

اگر دیکھا جائے تو اپنی زمین، ماحول، اقدار و عقائد اور ایمان و ایقان سے ''نسبت'' احمد شناس کے تخلیقی عمل کا بنیادی محرک ہے۔ اس نسبت کا اظہار 'صَلصال' میں شامل نظموں، ''ہمارے بچے''، ''وادی غیر ذرع'' حج ۲۰۱۰ء مولانا وحید الدین خان اور خصوصاً ''ماں اور کتاب'' میں تو ہوا ہی ہے لیکن یہ نسبتیں مشرقی، ثقافتی، روحانی اور صوفیانہ اقدار سے شدید قلبی وابستگی کی عمدہ مثالیں بھی ہیں۔

کشمیر کے مخصوص حالات کے تناظر میں لکھی گئی نظم ''ہمارے بچے''، ''اپنی زمین اپنی قوم'' سے احمد شناس کی نسبت کی بڑی سچی زندہ اور متحرک عکاسی کرتی ہے۔

خدواندا وہ خوشبو کے امانت دار بچے
چمن سے منُحرف ہیں پھول سے بیزار بچے
دُعا کی روشنی آنکھوں میں نہ رشتوں کی شبنم
کہ پھولوں کی جگہ ہیں سنگ کی بوچھار بچے

نظم ''حضرت ابراہیم کی وادی غیر ذی ذرع کے نام'' کی پوری فضا اساطیری ہے۔کلیدی استعارہ ''خوشبو'' کے حوالے سے احمد شناس نے اسلام اور امت مسلمہ کے عروج وزوال کے اسرار کی جانب بڑے ہی بلیغ اشارے کیئے ہیں۔ ساربان، غار، بیابان، بنجارہ، شہنشاہ، فقیر، وادی، پھول، دوسری دنیا جیسے استعاروں اور علامتوں کی مدد سے اس نظم میں اسلامی تاریخ کے ابتدائی باب کی ''خوشبو'' کو آج کے تناظر میں محسوس کرنے اور کروانے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔

ہندوستان کی عصری اسلامی تاریخ میں مولانا وحید الدین خاں ایک بہت ہی محترم نام ہے۔ عالم انسانیت کو ایک، وحدت کے سانچے میں ڈھالنا ان کا مشن ہے جس پر وہ بڑی دلجمعی کے ساتھ کئی دہائیوں سے کار بند ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان ہی نہیں دنیا کے بیشتر مما لک کے سنجیدہ سیکولر اور باشعور افراد عصر حاضر کے اس عظیم مسلم دانشور مولانا وحید الدین خاں کے عقیدت مندوں میں شامل ہیں۔احمد شناس بھی ان میں اسے ایک ہیں۔ مولانا سے متعلق احمد شناس کا منظوم خراج عقیدت، مولانا وحید الدین خاں کی ہمہ جہت دانشورانہ شخصیت اور کارناموں کی بڑی سچی مرقع کشی ہے ایک دو اشعار سے ہی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تو نوعِ آدم کو ایک وحدت سے جوڑتا ہے
خدا سے انسان کا رابطہ ہے شعور تیرا
ہمیں دکھاتا ہے دُھند کے اس طرف کا منظر
طلوعِ ایماں کا واقعہ ہے شعور تیرا
رُکے ہوئے قافلے کی تحریک بن گیا ہے
کہ حق کی دعوت کا واقعہ ہے شعور تیرا

یہ فکر کل کی اُمید بن کے کھلے گا احمدؔ
کہ آج کی فہم سے بڑا ہے شعور تیرا

مذکورہ نظم کے تمام اشعار میں سچائیوں کی خوشبو ہے۔

اب اگر 'صَلصال' کی قرات کے اگلے مرحلے کی طرف قدم بڑھائیں تو اندازہ ہوگا کہ احمد شناس کی نظم ''ماں اور کتاب'' غالباً مولانا وحید الدین خاں کی فکر اور دین و دنیا کے شعور کے بحر بیکراں کی آبجو ہے جس میں آدم، کائینات اور مظاہر قدرت کی تخلیق اور فنا اور بقا سے متعلق کتاب الفرقان اور ختم الرسل کے ارشادات اور انکشاف کو ماں کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ماں آدم کی جسمانی تخلیق اور ''کتاب'' ذہنی و روحانی تعمیر و تطہیر کا استعارہ ہے۔ رب العالمین نے کتاب الفرقان میں حرف حرف وجود آدم، کائنات اور مظاہر قدرت کے جو اسرار بیان کئے ہیں انھیں رسول پاک کے حوالے سے ماں ہی منکشف کرتی ہے۔ اسم اعظم کا امین، آدم، خدا کی سونپی ہوئی اس امانت کو بھول سا گیا ہے۔ حالانکہ خدا نے آدم پر کائنات کے سارے اسرار کے دروازے کھول رکھے ہیں کیونکہ خدا نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴

(بے شک ہم نے آدمی کو اچھی صورت بنایا)

(پارہ ۳۰، سورہ التین)

احمد شناس نے اس نظم میں ''ماں اور کتاب'' کا نہایت خوبصورت اور دل آویز موازنہ پیش کیا ہے۔ اس طویل نظم کے جو مختلف ٹکڑے ہیں وہ دراصل وجود سے عدم تک پھیلی ہوئی انسانی زندگی کے مختلف مراحل اور تاریخ کے مختلف ادوار ہیں۔

انسان کے علاوہ دوسری مخلوق کی دنیا میں ماں کا ایک متعین کردار ہوتا ہے۔ مگر

انسانی دنیا کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ یہاں ماں جنم داتا کے علاوہ ایک مفکّر، مدّبر، معلّم اور معمار کا کردار بھی ادا کرتی ہے جس طرح آسمانی کتابیں انسان کو یہ شعور عطا کرتی ہیں کہ زندگی فنا سے بقا کی طرف سفر کر رہی ہے۔ اسلئے انسان کی کامیابی کا راز اس بات میں مُضمر ہے کہ وہ بقائے حیات کیلئے جدو جہد کرتا رہے اس طرح ماں بھی اپنی تمام تر محبت، دانائی اور حکمت کام میں لاتے ہوئے بچوں کو دیدہ و نادیدہ جہانوں کے سفر کیلئے تیار کرتی رہتی ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب سے آدم نے اس دنیا میں آنکھ کھولی ہے۔ نظم کا یہ حصہ دیکھئے:

روزِ اول سے کلام اسکا تھا
الفاظ میں پوشیدہ معانی کی طرح
جب نہ جلتے تھے ابھی
ظلمت میں کتابوں کے چراغ
خود جلا کرتی تھی ماں
بچوں کی بصیرت کیلئے
ایک کہانی کی طرح

عمرِ رواں کے عروج:۔ یعنی شباب کا زمانہ واقعی کڑی آزمائش کا زمانہ ہوتا ہے۔ جب بچہ عہد جوانی میں قدم رکھتا ہے تو ماں جانتی ہے کہ یہ منہ زور امنگوں اور آرزوں کا زمانہ ہے۔ وہ فکر مند ہو جاتی ہے کہ تندیٔ ہوا کہیں بچے کو بکھیر کر نہ رکھ دے۔ اسلئے وہ اُسے مختلف مذہبی یا تاریخی کرداروں کے حوالے سے بتاتی ہے کہ اسے اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کس طرح کرنی چاہیے۔ نظم کا یہ حصہ دیکھئے کتنی خوبصورتی سے جوانی کے ایام کی تصویر کشی کرتے ہوئے حضرت یوسف علیہ اسلام کی حیا داری کے قصے کی یاد دلاتا ہے۔

دیکھنا تیرے رگ و پے میں طلوع ہونگے
نئی دھوپ کے چاند
ایک دن
تیری سماعت پہ ابھر آئیں گے
تصویر کے خاموش سرود

....

جب امنگوں سے شرابور گھٹا چھائے گی
حسن چہروں کا دل و جان سے بھائے گا تجھے
پھر زلیخاؤں کی ہر سازش سے
تیرے اندر کا حیادار
وہ یوسفؑ ہی بچائے گا تجھے

ماں کی نظر میں زندگی کوئی سپاٹ قسم کا معاملہ نہیں بلکہ پیچیدہ اور پراسرار راستوں کا سفر ہے۔ جب بچہ زندگی کے سفر پر روانہ ہوتا ہے یا عملی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو ماں اسے ایک مفکّر اور مدّبر کی طرح رموزِ حیات سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ نظم کا یہ بند دیکھئے:

صبحِ تخلیق سے اظہار کا تِشنہ ہے جہاں
ایک سورج ہے نظر میں
تو ہزاروں ہیں نہاں
تیرے سینے میں ہے پیوست
سوالوں کی کسک

پیڑ چھوٹا ہے
تو سایہ ہے افق تا بہ افق
یہاں قطرے میں ہے دریا
تو ہمالہ ہے کسی رائی میں
کھا کے ٹھوکر نہ تو گر جانا کہیں کھائی میں

نظم کا زیادہ تر حصہ ماں کا بچے کے ساتھ مکالمہ کی شکل میں ہے۔ مگر یہ کوئی عام قسم کا مکالمہ نہیں بلکہ اسکے اندر ایک روحانی تپش اور ایک فکری اضطراب پایا جاتا ہے۔ نظم کا سارا ماحول عرفان و آگہی کے ستاروں سے جگمگا رہا ہے۔ اور یہ اسلیئے ہے کیونکہ ماں کے علم و آگہی کا سرچشمہ ایک آسمانی کتاب کے اندر سے پھوٹتا چلا جاتا ہے۔ ماں بچے کو آہستہ آہستہ دنیاوی زندگی کے رطب و یابس سے گزارتی ہوئی ایک اور بہت بڑی خبر کی طرف لے جاتی ہے۔ یعنی موجودہ دنیا کے اندر سے ایک اور دنیا کے برآمد ہونے کی خبر اور یوم الحساب قائم ہونے کی خبر جس کے بارے میں قرآن انسان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہو۔ حالانکہ یہ ہمارے لئے یومِ موعود ہے اور یہ ہو کر رہے گا۔

دراصل قرآن میں قیامت کے واقعہ ہونے کا بیان کئی ایک جگہ پہ نو بہ نو انداز میں ہوا ہے۔ اسلوب بیان ایسا کہ دنیا کی کوئی دوسری کتاب اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ پڑھتے ہوئے بڑے سے بڑا پہاڑ جیسا انسان بھی خود کو ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ نظم میں شاعر نے اس واقع کا ذکر اپنے انداز میں کیا ہے۔ جو کہ خاصا اثر انگیز ہے۔

نظم کے آخری حصے میں بچہ اپنی کم مائگی اور سر برہنگی کو یاد کرتے ہوئے غم اور حیرت کی ملی جلی کیفیت سے دوچار نظر آتا ہے۔ وہ سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ آخر وہ ہستی جو

اسکے سر پہ ہمیشہ رحمتوں کا سایہ بن کر رہی ہے۔ روزِ محشر کو اسے بے یار و مدد گار کیسے چھوڑ سکتی ہے۔ اسلئے وہ علامتی زبان میں ماں سے مخاطب ہو کر سوال کرتا ہے۔

روح فرسا یہ خبر سن کے
میں اس سوچ میں ہوں
کہ سر برہنہ میں کدھر جاؤں گا
ماں
کیا تیرا سائیہ صد برگ
اُس روز مرے سر سے اتر جائے گا؟

دراصل یہ سوال اپنے آپ میں بڑا معنی خیز ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سوال کرنے والا یقین کے اس مقام پر ہے جہاں آدمی رحمت خداوندی سے مایوسی کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔

اس نظم کا راوی ''ماں'' کے سایہ صد برگ کی محافظت میں تو ہے لیکن اسے کتاب الفرقان نے فنا اور بقا کی آگہی بھی بخشی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس دن کا آنا طئے ہے جب کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور آرائش موجود کا طشت اُلٹ جائے گا۔ اللہ نے اپنی کتاب میں خود اس کی قسم کھائی ہے۔

''فلا اُقسمِهُ بالشِفق''
(تو مجھے ہے شام کے اُجالے کی)
''والَیل و ماوسَق''
(اور رات کی اور چیزیں اس میں جمع ہوتی ہیں)
''والَقمر واِذاتسق''
(اور چاند کہ جب وہ پورا ہو جائے)

''لا تر کَبُنَ طَبقاً عن طبق''

(تم کوضرورایک حالت کے بعد دوسری حالت پر پہنچنا ہے)

احمد شناس نے اس نظم میں اسلام کے عظیم تاریخی اور اساطیری کرداروں، حضرت محمد مصطفیؐ، حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ کے حوالے سے اپنے محسوسات کا بڑے یقین کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ نظم ماں اور کتاب پڑھتے ہوئے حفیظ جالندھری کے شاہنامہ، عمیق حنفی کی نظم ''صلصلتہ الجرس'' اور چندر بھان خیال کی تخلیق ''لولاک'' کے تاثرات بھی ذہن میں متحرک ہو جاتے ہیں۔ لیکن احمد شناس کی نظم اپنی ایمانی وروحانی تہہ داری اور لسانی وشعری نظام کی بنا پر اس نوع کی دیگر نظموں سے مختلف ومنفرد ہے۔

بحیثیت مجموعہ 'صَلصال' ایک ایسے پختہ کار اور زرخیز ذہن شاعر کا مجموعہ کلام ہے جو اپنی تخلیقی خود اعتمادی اور اعتقادی قوت کی بنا پر زمان ومکان کے حدود وامکانات کے آرپار ہوتے ہوئے اپنے جذبات ومحسوسات کی لسانی وشعری تشکیل کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

'صَلصال'۔ آواز اور سکوت کا خوبصورت سنگم

کرشن کمار طورؔ

یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارا معاشرہ آجکل جس تیزی سے تغیرات کا سامنا کر رہا ہے اس سے شاعری کی قدر و قیمت اور اہمیت رخِ جمال تک محدود نہیں رہ گئی ہے۔ نہ تو یہ دل بہلانے کا وسیلہ ہے۔ اور نہ محض معاشرتی عمل کی تجسیم۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں عار نہیں ہے کہ شعر کا تعارف کرنا یا پھر کروانا نہایت مشکل ہے۔ واقعی شعر کسی ایک لفظ میں محصور نہیں ہوسکتا۔ شعر جو کہ ایک بسیط حقیقت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایک نئی ذہنی تعمیر کا باعث بنتا ہے۔ ایک نئے ذہنی انقلاب میں مددگار و معاون ہوتا ہے۔ انسان کے اعلیٰ اور ارفع اقدار کی روشن مثال ہوتا ہے۔ اس بحث سے قطع نظر میرا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ شاعری اس کے کہنے اور کرنے والے کا ایک بسیط اور مکمل تعارف نامہ ہے، اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہے، اس کے ذہنی ممکنات کی حسین جھلک ہے۔ اس پس منظر میں ہم اگر احمد شناس کی شعری اور ادبی بالیدگی کو رقم کرنے کی کوشش کریں تو اظہار کے مختلف گوشوں کی نشاندہی کے لیے درج ذیل عنوانات قائم کیے جاسکتے ہیں۔

☆ کیا احمد شناس غیر مجسم حسن کا پرستار ہے۔

☆ کیا احمد شناس انسانی ہمہ جہت محبت کا طلبگار ہے۔

☆ کیا احمد شناس کا شعر فراق اور وصل کی رنگارنگ داستان ہے۔

☆ کیا احمد شناس کا شعر پیکر فانی کا وسیع سرمایہ ہے۔

☆ کیا احمد شناس واقعی آواز اور سکوت کا سنگم ہے۔

☆ کیا احمد شناس نے غم کی پردہ داری بھی کی اور اسے آشکار بھی کیا ہے۔

یہ اور اس قسم کے کئی مفروضے احمد شناس کی شعری اساس سے اخذ کئے جا سکتے ہیں اور ان پر سیر حاصل بحث وارد ہو سکتی ہے۔ تاہم یہ ممکن نہیں کہ احمد شناس کی شاعری کے لئے کوئی ایک عنوان قائم کیا جا سکے یا اُن کے شعر کو کسی ایک زاویے یا مخصوص نکتۂ نظر کی مدد سے دریافت کیا جا سکے۔ کیونکہ احمد شناس کی شعری کائنات دیدہ و نادیدہ جہانوں سے عبارت ہے۔ ان کے فکر کی پرواز ماورائیت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ مگر وہ زمین کے ساتھ اپنی گہری وابستگی کو قائم رکھتے ہیں۔ اُن کا شعر فکر و جذبے کی خوبصورت آمیزش سے تخلیق ہوتا ہے۔ تخلیقی شعر کی پہچان یہ ہے کہ وہ یک رنگ یا متعین رخ نہیں ہوتا بلکہ اُسے پڑھتے ہوئے آنکھوں کے آس پاس خیالوں کی قندیلیں جلنے لگتی ہیں اور ذہن میں لفظ و معنی کے دائرے بنتے چلے جاتے ہیں۔ احمد شناس کا شعر بھی ایسی ہی کیفیت کا حامل ہے۔ شعر کیوں کہ منبعٔ انوار ہوتا ہے اور اس کی تجلی وجدان اور شعور سے بوند بوند چھن کر اطراف کو خیرہ کر دینے والی ہوتی ہے۔ اب اگر میں اپنی باتوں کو احمد شناس کے اشعار سے واقعی نہ کروں تو خود پر بھی ظلم کروں گا اور ان پر بھی کہ اشعار کی چمک سے ہی دل اور ذہن کے اندھیرے فنا ہوتے ہیں۔

اک اور آسمان چمکتا ہے خواب میں
اک اور کائنات کا آئینہ دار ہوں

......☆......

گم شدہ ہے کون میری حیرتوں میں
کس کی خاطر غار کا سینہ کھلا ہے

......☆......

کوئی چہرہ نہیں خوشبو کا لیکن
تماشہ پھول والوں کا لگا ہے

......☆......

ابھی چہرے کا خاکہ بن رہا ہے
ابھی کچھ اور بھی میرے سوا ہے

......☆......

میں اس کی پہچان ہوں یا وہ میری
کیا سمجھوں اور وہ سمجھائے کیا کیا

......☆......

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ شعری کتابوں کے نام شعری شخصیت کے آئینہ دار نہیں ہوتے اور ہو بھی نہیں سکتے کیونکہ شعر میں تمام ممکنات کی جھلک ہوتی ہے۔ سارے رخ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جبکہ شاعر کی زندگی کم و بیش یک رنگ اور متعین رخ کی ہوتی ہے۔ لیکن شاعر ہر صورت میں محبت کا شاعر نظر آنے میں مسرت کا احساس کرتا ہے اور محبت کی ہمہ جہتی اس کے ذہنی اور روحانی بالیدگی کا اشاریہ بن جاتی ہے۔ یہی وہ احساس ہے جو کہ اعلیٰ اور ارفع وقار کے مماثل نظر آتا ہے۔

انسانی ہمہ جہت محبت کے لئے کیا کسی شاعر کا تجربۂ علم ہونا ضروری ہے یا پھر محض خیال آفرینی اور جذباتیت اس اجتماعی مقصدیت کے لئے کافی وشافی ہے۔ دنیا بھر کی قدیم اور جدید شاعری اپنی فکر اور تجربہ سے ہزار ہا تکلف کے باوجود اس قدر کی پاسدار ہے۔ اگرچہ محبت کے لئے کسی پیمانہ بلکہ ناقدانہ پیمانہ کی ضرورت اس کی نفسی، اخلاقی اور معاشرتی اہمیت کے یکسر منافی ہے۔ احمد شناس نے اپنے شعری کارگاہ میں محبت کے لازوال حسن

اور گہرائیوں کو بڑے عالمانہ شان اور وسعت سے برتا ہے اور اس کی نشان دہی کی ہے۔ ان کے ہاں انسانی ہمہ جہت محبت کا پیمانہ صرف اور صرف ایک ہے۔ وہ ہر طرح سے اسے ایک نئے رخ سے پیش کرنے پر قادر ہیں اور اگر از راہ منصفی دیکھا جائے تو وہ ان لطیف مضمرات سے نبرد آزما ہونے میں پوری طرح وسیع الرخ ہیں اور کامل القادر ہیں۔ آیئے ان کے چند اشعار سے لطف اندوز ہوں اور اس امر کا ثبوت بہم پہنچائیں۔

بدل کے دیکھو کبھی نسبتوں کی دنیا کو
بدن کو روح کے خانے میں ڈال کر دیکھو

......☆......

چاند میں درویش ہے جگنو میں جوگی
کون ہے وہ اور کس کو کھوجتا ہے

......☆......

سینے میں کوئی زخم کہ کھلنے کے لئے ہے
آنکھوں میں کوئی اشک کہ رونے کے لئے ہوں

......☆......

مٹا دیتا ہے ہر تصویر میری
مجھے اپنا بنا رکھا ہے اس نے

......☆......

امیر اس کی امانت اٹھا نہیں سکتا
فقیر اصل میں اس کا خزانے والا ہے

......☆......

فراق و وصل دراصل آفرینیش سے شاعری کا موضوع رہے ہیں اگرچہ ہر شاعر نے اپنی توفیق، فنی صلاحیت، معروضیت اور جانب داری سے انہیں مختلف حالات اور پس منظر میں مختلف انداز میں رقم طراز کیا ہے۔ احمد شناس نے بھی ان کی گہرائیوں کا بہ استحسان مطالعہ اور مکاشفہ کیا ہے اور اپنے اشعار میں ان کی تعمیر کی ہے۔ احمد شناس نے اپنی شاعری میں ان کے محض لغوی معنی بتانے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کی اہمیت اور تطہیر کو ایک خاص زاویئے اور خصوصیت سے ترتیب دیا ہے۔ اس سے بادی النظر میں ایک خاص فائدہ ان کی شاعری کو یہ ہوا ہے کہ ان کا آہنگ بلکہ شعری آہنگ ہمارے خون کی گردش سے منتصل ہو کر گردش کرنے لگتا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے ان کا شعری آہنگ اور فکری انداز ایک خاص انداز سے فراق و وصل کے نظریے اور عقیدے سے بھرپور لطافت اور حسن سے گرفت میں آجاتا ہے۔ فراق و وصل کا موضوع کچھ ایسا سطحی اور سامنے کی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے لئے شاعر کی ہمہ گیر گرفت نہایت ضروری ہے۔ یہ شاعرانہ ارتقا کے لئے ضروری بھی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ احمد شناس اس پیمانہ پر کھرے اترے ہیں اور تکلف کے باوجود ان کا شعر ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ کیوں نہ احمد شناس کے چند اشعار سے اپنے قلب کو اطمینان بخشیں۔

اسی ہوا میں محبت کا دیپ جلتا ہے
اسی جہاں کو جہانِ وصال کر دیکھو

......☆......

جب تک لہو کی آگ سلگتی ہے جسم میں
آئے گی بار بار مرے امتحاں کی رات

......☆......

میں اس کی بارشوں کا منتظر ہوں
وہ مجھ سے میرے آنسو مانگتا ہے

......☆......

کون قطرے میں اٹھاتا ہے تلاطم
اور انتر آتما تک سینچتا ہے

......☆......

ہر وہ شخص جسے یہ احساس ہے کہ وہ اس ناپائیدار دنیا میں چند ساعتوں کا مہمان ہے اور کسی بھی لمحے اس کا ناتا اس فانی دنیا سے ٹوٹ سکتا ہے۔ اگر وہ اپنی تحریر میں حزن و ملال کا اظہار نہیں کرتا، اس کے شعر میں شکست خوردگی یا پھر پست ہمتی کا شائبہ نظر نہیں آتا اگر ہماری داد کا مستحق نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ احمد شناس کی شاعری بھی بہت سے شاعروں کی مانند روح عصر کا بے حد فن کارانہ انداز ہے۔ وہ اپنی شاعری میں اپنے کرب ذات کو بے حد سکون کے ساتھ شعر آمیز کرتے ہیں۔ وہ خود اپنے ذہنِ نارسا کی رفعت اور جذبہ کی مجسمیت میں رطب اللسان ہیں۔ ان کا شعر ایک ایسی دستاویز ہے جہاں انسانی نفسیات کی بڑی خوبصورت تفسیر موجود ہے۔ احمد شناس مرگ طلب نہیں نہ وہ ڈرتے ڈرتے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے ہاں شعر میں صحت مند تنقیدی مطالعہ کی توسیع نظر آتی ہے اور یہ تمام انسانیت کے لئے ایک مثال کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لطف کو اس فرحت کو آپ خود طلبی کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ اور لطفِ ذات کا بھی۔ آیئے احمد شناس کے کچھ اشعار کے ساتھ اس حسن اور خوبی سے بہرہ ور ہوں۔

غاروں کا سفر ہے کہ مکمل نہیں ہوتا
میں اپنی خبر آپ ہی ڈھونے کے لئے ہوں

......☆......

زندہ انساں اسے آباد کیا کرتے ہیں
گھر کسی خواب سے معمور نہیں ہوسکتا

......☆......

تونے مجھے خیال کیا تھا اسی طرح
گردو غُبار میں بھی ستارہ شعار ہوں

......☆......

جینے کا تقاضا مجھے مرنے نہیں دیتا
مرکر بھی سمجھتا ہوں کہ ہونے کے لئے ہوں

......☆......

پھول باہر ہے کہ اندر ہے میرے سینے میں
چاند روشن ہے کہ میں آپ ہی تابندہ ہوں

......☆......

شعر محض عروضی قواعد کی پابندی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک وسیع تر چیز کا نام ہے۔ شعری آہنگ شعر کی وہ تمام حرکات ہیں جنہیں الفاظ میں قید کیا جاتا ہے۔ لفظی استعمال سے شاعراتی اور تصوراتی حسن باعمل ہوجاتا ہے اور ایسے ہی تجربات شاعر کے ذہن میں images کی شکل میں رونما ہوتے ہیں اور جذباتی شدت کے مظہر بھی، مختلف آہنگ نغمگی کا احساس رکھتے ہیں اور تخلیق میں اس آہنگ، اس موسیقیت کا خلق ہونا، بیدار ہونا ایک قدرتی واردات کا مظہر ہے۔ احمد شناس نے اپنے شعری اور تخلیقی ضابطہ میں اس بات کا بے حد خیال کیا ہے کہ ان کا شعر محض وارد نہ ہو بلکہ اس کا نزول محسوسات کی ایسی ساکن سطح پر ارتعاش کے در وا کردے جو بصارت اور بصیرت کے دامن کو تھام لے۔ ان کا شعر

جامد اشیا اور سرسری گزرتے ہوئے دل کے واقعات کو زبان دینے پر قادر ہوتا ہے۔ آیئے ان کے اشعار سے اپنے خیال کے وجود میں نیا روزن پیدا کرنے کی سعی کریں۔

سات قلزم ہیں مرے سینے میں
ایک قطرے سے ابھارا تھا مجھے

......☆......

کھو گیا وہ اشتہاروں کے سفر میں
روز اخباروں میں خود کو ڈھونڈتا ہے

......☆......

میرے اندر بھی ترے نام کی چنگاری ہے
تو مرے واسطے کیوں طور نہیں ہو سکتا

......☆......

پھر اس کے بعد بس حیرانیاں ہیں
خبر والا بھی خاصا بے خبر ہے

......☆......

بغیرِ جسم بھی ہے جسم کا احساس زندہ
یہ خوشبو بانٹنے والی ہوائیں بھی قیامت

......☆......

ایسی واردات میرے خیال میں ہر شاعر کے ساتھ ہوتی ہے جہاں اس کا تجربہ شعر کی جذباتی شدت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کا شعر گذرتے ہوئے دل کے واقعات کو زبان دینے پر قادر ہوتا ہے۔ شعر میں تخیئل مائل بہ کلام ہونے لگتا ہے اور اپنی روشنی سے چار دانگ عالم کو روشن

کر دیتا ہے۔ اکثر و بیشتر شاعر موضوعی صورت حال سے ہٹ کر معروضی انداز میں اپنے اکناف میں رونما ہونے والی تبدیلی کو اپنے منفرد انداز سے دیکھتا ہے۔ اس میں فینٹسی اور تخئیل کا دخل ناگزیر ہوتا ہے۔ وہ بات کو ظاہر کرنے کی بجائے اس کے نزول پر ایک قسم کا مہین پردہ ڈال دیتا ہے۔ شاعری میں شعر کی موجودگی یا عدم موجودگی اس بنیاد کی حامل ہوتی ہے کہ شاعر نے کیا کچھ ظاہر کیا ہے اور کیا کچھ پردۂ اخفا میں رکھا ہے۔ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کہی بات ہی ذہنی تغیر کو نشان زد کرتی ہے۔ ایسا فن جو خاموشی کا تحرک ہے ہماری غزل کا بے حد طاقت ور پہلو ہے۔ بلکہ میں تو اسے شاعری کی مرکزی حیثیت کا ہی نام دوں گا۔ آج کے فنی دور میں یہی ایک پہلو ہے جو ہمیں ہمارے عظیم ورثہ اور روایت سے ہم کنار کرتا ہے۔ اپنے ماضی کے رشتے سے جوڑتا ہے۔ احمد شناس کا شعر بھی اپنے اس بنیادی مقصد کو ایک صوفی شاعر کی طرح موجودات سے تعلق شناس کرتا ہے۔ ایک کم حیثیت حباب کو سطحِ دریا پر سر اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔ اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

وہ میرے علاوہ مجھے چاہتا ہے
بڑی مختلف ہے کہانی کی صورت

......☆......

سورج کیا کیا رنگ دکھاتا رہتا ہے
کیا کیا منظر اس پردے کے پیچھے ہیں

......☆......

بنا دیکھے گواہی مانگتا ہے
سوال اپنا جدا رکھا ہے اس نے

......☆......

بس اس کی پہچان یہی ہے
آنکھ میں آنسو بھرنے والا

......☆......

پر شکستہ ہے پرندہ اس سفر میں
اور سایہ ہے کہ اڑتا جارہا ہے

......☆......

میں نے احمد شناس کے بصیرت افروز شعر پر یہ ایک تجریدی تحریر رقم کی ہے۔جس میں یقیناً ان کے شعر کے کئی پہلو تشنہ رہ گئے ہوں گے جن پر تفصیل سے لکھا جاسکتا تھا۔ کیونکہ ان کی غزلوں میں تمثال کاری کے بہترین نمونے ہیں۔ ان کے اشعار کی ماہیت میں نئے فکری عوامل کو تلاش کرنا اور انہیں برسرِ عام لانا ابھی باقی ہے۔جنہیں میں ان کے دیگر پسند کرنے والوں پر چھوڑتا ہوں۔

'صَلصال' میں ''ماں اور کتاب'' کے عنوان سے طویل نظم شامل ہے۔اس نظم کا اپنا ایک مخصوص مزاج اور منفرد انداز ہے۔جس کے بارے میں یقیناً اہلِ علم سیر حاصل بحث کریں گے۔ احمد شناس کے شعر کی قوت لامحدود ہے۔ان کا تحرک بے پایاں ہے۔ان کی روایت فراز آشنا ہے۔ میں ان کے ایک شعر سے اپنی شعری تجسیم کو وقفہ دیتا ہوں۔

تو نے کس شوق سے لکھا ہے تعارف میرا
میں کسی لفظ میں محصور نہیں ہوسکتا

......☆......

چند باتیں 'صَلصال' کے حوالے سے

احمد شناس

میری پہلی شعری تخلیق 'پس آشکار' سال 2010ء میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ اس اعتبار سے 'صَلصال' کا شعری سفر یا پھر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ 'صَلصال' کی اشاعت کا سفر تین سالوں میں طے ہوا ہے۔ جب کوئی تخلیقی کام ظہور پذیر ہوتا ہے تو وہ زمان ومکان کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک پھول نمو پذیر ہونے کے بعد صرف پھول کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ جگہ اور وقت کی نسبت اسکے لئے بے معنی ہو جاتی ہے۔

'صَلصال' کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ کتاب زندگی کے سفر میں میرے ساتھ ساتھ رہی ہے۔ وہ رنگ ونور کی وادیوں کا سفر تھا یا جلتے ہوئے صحراؤں کا۔ دیس پردیس کا رزق کھاتے ہوئے اور دریاؤں اور چشموں کا پانی پیتے ہوئے یہ میرے ساتھ تھی۔ ہنستے اور روتے ہوئے یہ میرے ساتھ تھی۔ میرے گھر میں اور گھر کے اندھیروں، اجالوں میں یہ میرے ساتھ تھی۔ یہ زندگی ہی کے رطب دیابس سے برآمد ہوئی ہے۔ مگر یہ زمین کے کسی مخصوص خطے سے منسوب نہیں ہے۔ اسکا کوئی جغرافیہ ہے نہ اسکی کوئی تاریخ۔ ابتدا ہے نہ اسکی کوئی انتہا۔ یہ میری ذات کا حصہ ہوتے ہوئے بھی میری ذات سے الگ اپنا ایک وجود رکھتی ہے۔

'صَلصال' کے بارے میں سوچتے ہوئے اکثر ایک سوال میرے ذہن میں آتا

ہے کہ کیا زندگی کی باقی ضرورتوں کی طرح یہ کتاب بھی میری ایک ضرورت ہے؟ انسان کے اندر فطری طور پر چیزوں کے بارے میں جاننے اور انہیں دریافت کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اسی کا نام علم ہے۔ علم انسان کی ضرورت ہے۔ وہ ہمیشہ سے اپنے بارے میں اور کائنات کی دوسری جاندار اور بے جان چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا ہے۔ ان معلومات یا حقائق پر مبنی علم کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ بالکل اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ شدّت کے ساتھ ایک اور چیز ابتداء ہی سے انسان کی ضرورت رہی ہے۔ اور وہ ہے۔ خیال آفرینی یا افسانہ طرازی جسے لٹریچر میں Fiction کہا جاتا ہے۔ انسان چونکہ ایک ایسی دنیا میں سکونت پذیر ہے۔ جہاں بہت کچھ پسِ پردہ ہے۔ اسلئے یہ خیال آفرینی یا واہمہ سازی اسکی بہت بڑی ضرورت ہے۔ یہ اسلئے بھی انسان کی ضرورت ہے کیونکہ وہ فطری طور پر Creative aesthete یعنی جمالیات سے شغف رکھنے والا تخلیق کار واقع ہوا ہے۔ جس طرح وہ خود تحقیق کر کے یا دستیاب سائنسی علوم کا مطالعہ کر کے چیزوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کا جنون رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ خود ادب یا فن تخلیق کر کے یا تخلیق کئے ہوئے ادب اور فن سے محظوظ ہو کر اپنے وجود کے خالی پن کو پر کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے یا پھر زندگی کے بارے میں کسی اور بڑی خبر یا جانکاری کی تلاش میں رہتا ہے۔ جو اسے دوسری کتابوں سے نہیں مل سکتی۔

تخلیقی ادب زندگی کے دوسرے علوم سے مختلف ایک چیز ہے۔ دوسرے علوم میں چیزوں کو براہِ راست معلومات کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ مگر شاعری میں مشاہدے میں آنے والی چیزیں زیادہ تر علامتی اظہار کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ ایک تخلیقی شاعر جب درخت کو دیکھتا ہے تو وہ اسکی شاخوں اور پتوں کی بات نہیں کرتا۔ بلکہ وہ درخت کی اصطلاح میں ماورائے درخت کسی چیز کی بات کرتا ہے۔ ایک سائنس دان جب یہ کہتا ہے کہ نظر آنے والے ستاروں کے علاوہ

بھی اس خلا میں بے شمار دوسرے ستارے موجود ہیں۔ تو ظاہر ہے وہ ستاروں ہی کے بارے میں بات کر رہا ہوتا ہے۔ مگر ایک شاعر جب یہ کہتا ہے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تو یہاں شاعر کا موضوعِ گفتگو ستارے نہیں ہیں بلکہ وہ ستاروں کے حوالے سے زندگی کے نہ ختم ہونے والے تسلسل کی بات کر رہا ہے۔

جہاں تک شاعر کی ذاتی محرومیوں یا ان سے وابستہ دکھوں کا تعلق ہے تو ایک اچھا شاعر کبھی انہیں تشت از بام نہیں ہونے دیتا۔ میں سمجھتا ہوں شاعر زندگی کے ڈرامے میں ایک ایسے کردار کی طرح ہے جو کہانی میں antidote کا کام کرتا ہے۔ وہ زندگی کی تلخیوں اور ناخوشگواریوں کو اپنی جان پر سہن کر کے ایک خوش آیند اور خوش ذائقہ چیز دوسروں کو دیتا ہے۔ وہ ماحول میں بسے ہوئے زہر کو اپنے اندر جذب کر کے بادِ صبا کے نرم و نازک جھونکوں کی طرح خوش احساس نغموں کی تخلیق کرتا ہے۔

مشہور امریکی شاعر Carl Sandburg نے کہا تھا

Peotry is the journal of the sea animal,living on land, wanting to fly in the air. Peotry is search for syllables to shoot at the barriers of the unknown and unknownable.

میری حقیر رائے میں شاعری محدود سے لامحدود کی طرف چھلانگ ہے۔ موجود سے ماورا کی جانب سفر ہے۔ یہ Self میں Selflessness کی تلاش ہے۔ یا پھر جسم کے اندر غیر مجسم چیز کی پیاس ہے۔

انسانی زندگی بیک وقت دو مختلف سمتوں میں سفر کرتی ہے۔ ایک باہر اور

دوسرے اندر کی طرف یا دوسرے لفظوں میں ایک جسمانی اور دوسرے ذہنی سمت میں۔ عام طور پر انسان کی نظر باہر رُخی ہوتی ہے۔ اسلئے وہ باہر کی چمک دھمک کے حوالے سے چیزوں کو اہمیت دیتا ہے۔ وہ شب و روز ایک ہی تگ ودو میں لگا رہتا ہے کہ جسم کیلئے زیادہ سے زیادہ آرام و آسائش کیسے حاصل کرے۔ ضروریاتِ جسم کے حصول کی اس دوڑ دھوپ میں اُسکا ذہنی یا روحانی سفر وقتی طور پر رک جاتا ہے۔ قدرت انسان کیلئے ایسے مواقع پیدا کرتی رہتی ہے جو اسکی فکر کو انگیخت کرنے والے ہوتے ہیں تاکہ وہ تدبّر اور تفکّر کے مراحل سے گزر کر اپنا ذہنی سفر دوبارہ شروع کر سکے۔ البتہ ان مواقع سے فائدہ ہر انسان اپنی توفیق کے مطابق اٹھاتا ہے۔

ایک دانشور کا قول ہے کہ میں نے اپنے خدا کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔ دراصل شکست وریخت کے یہی وہ لمحات ہیں جو ذہنی ارتقا کیلئے غذا کا کام کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں 'صَلصال' میں شامل شعری تخلیقات کے زمانے کو ذہنی سفر کے ایک نئے دور سے تعبیر کرتا ہوں۔ ایک ایسا دور جب سچائی اپنی تمام تر برہنگی کے ساتھ کھلتی جا رہی تھی اور میں زندگی کی سب سے بڑی حقیقت یعنی وجود کی بے رحم تنہائی کو دریافت کرنے لگا تھا۔ جب سماج کے فرشتوں کا جھوٹ زہر بن کر رگ وپے میں اترنے لگا تھا۔ جب مذہب کی مقدّس گدیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے ساتھ واسطہ پڑنے پر یہ منکشف ہوا تھا کہ دراصل یہی وہ لوگ ہیں جو مذہب کو اسکی بنیادوں سے کھوکھلا کرتے جا رہے ہیں۔

آج ایک طرف اکیسویں صدی کا سائنسی ذہن ہے جو مذہب کو غیر ضروری یا irrelevent چیز سمجھتا ہے۔ دوسری طرف کرۂ ارض کے جس حصے میں مذہب کے ساتھ وابستگی کی دھوم دھام نظر آتی ہے۔ وہاں مذہب بے روح جسم کی آرائش کا نام ہے۔ وہاں کا مذہبی انسان دراصل ایک مخصوص گروہ یا گروپ کا انسان ہے۔ جسکی ساری محنت اس کام میں

خرچ ہورہی ہے کہ وہ دوسروں پر اپنے گروہ کی برتری کیسے قائم کرے۔ اس مذہبی دنیا میں جس قبیل کے اہلِ دانش کا بول بالا ہے وہ مذہب کو اُس کی آفاقیت کے حوالے سے دریافت کرنے اور اسے جدید انسان کی دلچسپی کا موضوع بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس وہ اپنے متعصّبانہ رویوں سے ایک لامحدود چیز کو محدود کرنے کی روش پر چل رہے ہیں۔ یہ کس قدر غیر فطری تضاد ہے کہ ایک طرف اکیسویں صدی کا Knowledge explosion اور دوسری طرف مذہب کا Tight compartment میں تبدیل ہونے کا عمل۔

سچ تو یہ ہے کہ آج ہمارے ادبی حلقوں کا کیس بھی Tight Compartment کا کیس بنتا جارہا ہے۔ اب ان حلقوں کے اندر کھلے ذہن کے وہ لوگ نہیں ملتے جو کبھی انکی پہچان ہوا کرتے تھے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب زندگی کے باقی شعبوں میں گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ مگر علم دفن کے شعبوں میں تازہ ہوا کے جھونکے چلتے رہتے تھے۔ مگر اب صورت حال بالکل مختلف ہے۔ اب ان اداروں کے اہلِ علم سچ بولنے سے گھبراتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک خوف کے حصار میں ہیں۔ اب بے لاگ تجزیہ محدود ذہنی نکتۂ نظر کی بھینٹ چڑھتا جارہا ہے۔ اب یہ بات پروفیسر صاحب کی طبعِ نازک پہ بہت گراں گزرتی ہے کہ آپ اپنے اشعار یا اپنی تحریر میں سچائی کا بے رحمانہ اظہار کرتے ہیں۔ یا کسی ایسی شخصیت کے حوالے سے بات کرتے ہیں جو وسیع تر انسانی اور آفاقی تناظر میں چیزوں کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ترقی یافتہ دنیا کے مقابلے میں ہمارے یہاں کے علمی وادبی اداروں کا آگے کا سفر کہیں منقطع ہو کر رہ گیا ہے۔

ہمارے یہاں شعر کو دریافت کرنے کا عمل زیادہ تر نقاد کی سطح پر ہوتا ہے۔ خود شاعر کی سطح پر یہ عمل بہت کم ہوتا ہے یا بالکل ہوتا ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ ایک طرح کا تغافل ہے۔ کیونکہ نقاد تو بہت بعد میں آتا ہے۔ اس سے بہت پہلے ایک لکھنے والا اپنی تمام

ترفہم وفراست کے ساتھ آچکا ہوتا ہے۔ اسلئے شعر کو پرکھنے اور دریافت کرنے کا کام سب سے پہلے خود شاعر کو کرنا چاہیئے۔ تاکہ وہ شعر کے ساتھ ایک زندہ اور شعوری تعلق قائم کر سکے۔ میں سمجھتا ہوں اس دریافت کیلئے شاعر کو خود اپنے آپ سے کچھ بنیادی سوالات کرنا ہونگے۔ مثلاً۔ میں شعر کیوں لکھتا ہوں؟ شعر کے ساتھ میری وابستگی کی نوعیت کیا ہے؟ وہ کون سا سوال، ذہنی خلجان یا فکری تردّد ہے جو شعر کی صورت میں ڈھل جانے کیلئے میرے اندر موجزن ہے؟ کوئی دوسرا شعر کے بارے میں یہ سوال اٹھائے یا نہ اٹھائے خود شاعر کو اپنی شعری تخلیق سے متعلق اس طرح کی بے باکانہ چھان بین کے عمل سے ضرور گزرنا چاہیئے۔ یہ دراصل شعر کے حوالے سے اپنی متاعِ فکر اور سرمایۂ حیات کو دریافت کرنے کا معاملہ ہے۔ اسلئے شائد اسکا صیح نکتۂ آغاز بعد از تخلیق نہیں بلکہ قبل از تخلیق ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ کارگاہِ شعر میں داخل ہونے سے پہلے یہ پتہ ہونا چاہیے اور نہ صرف پتہ بلکہ یقین ہونا چاہیے کہ شاعر کے پاس وہ ضروری ساز وسامان ہے جو یہاں صرف ہونے والا ہے۔ ورنہ خالی ہاتھ وہ چیز اختراع نہیں ہوسکتی جسے شعر کہتے ہیں۔

اردو شاعری میں جدیدیت کی لہر ایک سیلاب کی طرح آئی اور گزر گئی۔ مگر یہ ایک ایسا سیلاب تھا جو اپنے ساتھ بہت سے گوہر آبدار بھی لایا تھا۔ اگرچہ ساحل پہ سفید جھاگ کے نشانات زیادہ دیکھنے میں آئے۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی تحریک تھی جسے ہم تجدیدِ اظہار کی تحریک کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے۔ موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے جدیدیت نے اردو شعر کو ایک نئی پہچان دی ہے۔ اس تحریک کے دوران کچھ ایسے جیالے بھی میدان میں اُترے جنہوں نے نئے تجربات کے ذریعے پرانے روایتی بتوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ مثلاً آزاد نظم اور آزاد غزل کے تجربات۔ نظم تو بہر حال کسی نا کسی طرح آزاد ہو ہی گئی اور اب آزاد نظم ایک

مقبول صنف سخن کی حیثیت سے اردو ادب میں اپنی پہچان بنا چکی ہے۔ مگر جہاں تک غزل کا تعلق ہے اسکو آزاد کرنے کا خواب خواب ہی رہا۔ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ جدیدیت کا بڑے سے بڑا بت شکن بھی غزل کے ردیف وقافیہ کے خمار سے باہر نکلنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ اب تو یہ طے ہے کہ اردو غزل قیامت تک اپنے اسی فارم میں زندہ رہے گی جو اسکے اکابر نے اسکے لئے تیار کیا تھا۔ مگر اردو غزل کے ساتھ ایک اور المیہ یہ ہے کہ موضوع کے اعتبار سے بھی اسکے اندر روایت پرستی کا زبردست رجحان پایا جاتا ہے۔ جدیدیت سے بہت پہلے اقبال جیسے قد آور شاعر نے اسے روایت کی تنگ پگڈنڈی سے نکال کر نئے موضوعات کی ایک بڑی شاہراہ پر ڈال دیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے نہ وہ روایت آگے بڑھ سکی اور نہ ہی جدیدیت کی تحریک غزل کے مزاج میں کوئی مستقل اور دیرپا تبدیلی لاسکی۔

آج جس دور سے ہم گزر رہے ہیں۔ اُسے اہل ادب مابعد جدیدیت کا دور کہتے ہیں۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مابعد جدیدیت کے ادب کے مخصوص خدوخال کیا ہیں؟ کیا اس ادب کی الگ سے کوئی شناخت قائم کی جاسکتی ہے؟ کیا مابعد جدیدیت کی شاعری وہی ہے جو آجکل رسائل اور جرائد میں چھپ کر سامنے آرہی ہے؟ کیا آج کا دور پہلے سے کہیں زیادہ Crises کا دور نہیں ہے؟ کیا وجہ ہے کہ انتہائی سنجیدہ اور المناک انسانی مسائل کے باوجود آجکی اردو شاعری خاص کر غزلیہ شاعری حالات کی عکاسی کرتی نظر نہیں آتی اور نہ ہی نئے موضوعات کی تلاش کے لئے کوشاں نظر آتی ہے۔

بہر حال میں ان تمام سوالات کے بیچ اپنی نئی کتاب 'صَلصال'، ادب کے سنجیدہ اور ذہین طالب علم کو پیش کرتا ہوں۔ اب یہ اُس پر ہے کہ وہ آج کے شعری منظرنامے کے تناظر میں اس کتاب کو کیسے دیکھتا ہے۔ اس کے اندر کیا کیا کچھ نیا اور منفرد دریافت کرتا ہے۔ اور اسکی کیا قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔



صبحِ وجود ہوں کہ شبِ اِنتظار ہوں
میں آشکار ہوں کہ پسِ آشکار ہوں

ہر رنگ بیقرار ہوں ہر نقش ناتمام
مٹی کا درد ہوں کہ ستاروں کا پیار ہوں

کچھ تو میرے وجود کا حصّہ ہے تیرے پاس
ورنہ میں اپنے آپ میں کیوں انتظار ہوں

اک اور آسمان چمکتا ہے خواب میں
اک اور کائنات کا آئینہ دار ہوں

تو نے مجھے خیال کیا تھا اسی طرح
گرد و غبار میں بھی ستارہ شعار ہوں

جاری ہو بے مہار تعلق کی سلسبیل
اک ایسی برشگال کا امیدوار ہوں

کیسے کھڑا ہوں کس کے سہارے کھڑا ہوں میں
اپنا یقین ہوں کہ ترا اعتبار ہوں

اک بار اپنے گھر سے نکالا گیا تھا میں
پھر اس کے بعد گردشِ لیل و نہار ہوں

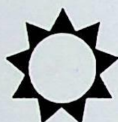
بس کچھ دنوں کی اور صعوبت ہے دھوپ کی
صحرائے جسم پار کوئی برگ زار ہوں

تیرے جمال سے میری آنکھوں میں نور ہے
تیرا خیال ہے تو میں باغ و بہار ہوں

سانسوں کے درمیان سلگتے ہیں بال و پر
پھر بھی کسی اُڑان کا امیدوار ہوں

احمدؔ کسی زمان و مکاں کا نہیں ہوں میں
لمحوں کی دیر ہے جو سرِ آبشار ہوں





میری راتوں کا سفر طور نہیں ہو سکتا
تُو نہ چاہے تو بیاں نور نہیں ہو سکتا

میں نے ہجرت کے کئی دور کڑے دیکھے ہیں
میں کتابوں سے کبھی دور نہیں ہو سکتا

میری فطرت کہ میں کھِل جاتا ہوں بے موسم بھی
میری عادت کہ میں مجبور نہیں ہو سکتا

تو نے کس شوق سے لکھا ہے تعارف میرا
میں کسی لفظ میں محصور نہیں ہو سکتا

میرے اندر بھی ترے نام کی چنگاری ہے
تو میرے واسطے کیوں طور نہیں ہو سکتا

جو یہاں لفظ کی سرحد کے اُدھر رہتا ہے
بستیوں میں کبھی مشہور نہیں ہو سکتا

زندہ انساں اسے آباد کیا کرتے ہیں
گھر کسی خواب سے معمور نہیں ہو سکتا

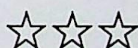
گھر کے باہر سبھی لفظوں کے تماشائی ہیں
گھر کے اندر کوئی مسرور نہیں ہو سکتا

جسم کے سارے تقاضے ہیں ادھورے احمدؔ
یہ تصور کبھی بھرپور نہیں ہو سکتا





میں جو کھلتا ہوں زمیں پر تو اِسی جوہر سے
میرا ہر رنگ تیری رحمتِ باران سے ہے
دوسرا کون ہے جو مجھ کو بچا سکتا ہے
تُو اگر آپ ہی بیزار میری جان سے ہے



کون ہے وہ؟

ذرّہ ذرّہ اس زمیں کا سوچتا ہے
کون اس پردے کے پیچھے دوسرا ہے

کون ہے جو آئینہ در آئینہ ہے
دُور تک حیرانیوں کا سلسلہ ہے

کوئی چہرہ ہے کہ چہرہ ماورا ہے
پھول ہے وہ یا تصّور پھول کا ہے

کون میرے راز سارے جانتا ہے
بند خوشبو کے دریچے کھولتا ہے

برف کے اونچے پہاڑوں کی ادا ہے
حسن کس کا؟ آبشاروں کی دعا ہے

کون اڑنے کی ترنگوں میں چھپا ہے
کون چڑیوں کی امنگوں کا خدا ہے

کون مجھ سے میرے آنسو مانگتا ہے
کس سے میرا واسطہ اظہار کا ہے

چاند میں درویش ہے جگنو میں جوگی
کون ہے وہ اور کس کو کھوجتا ہے

کون ہے جو برف کی چادر بچھا کر
دھڑکنوں کی دھوپ مجھ سے مانگتا ہے

کون قطرے میں اُٹھاتا ہے تلاطم
اور انتر آتما تک سینچتا ہے

حادثہ بیرونِ ہستی تھا کہ اندر
سنگِ امکاں ریزہ ریزہ ہو گیا ہے

گم شدہ ہے کون میری حیرتوں میں
کس کی خاطر غار کا سینہ کھلا ہے

درد کس کا ہے یہاں مغرب کا سورج
کون صحرا میں مشقّت کر رہا ہے

میرے خوابوں کو جلا رکھا ہے کس نے
جب اماوس ہو تو جگنو بھیجتا ہے

خود فراموشی کے جنگل سے اٹھے گی

آگہی بھی صبحِ صادق کی ہوا ہے

کون کھِلتا ہے مری خوشیوں میں احمدؔ

کون میرے ساتھ بیٹھا رو رہا ہے





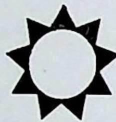
زمیں کے اظہارِ رنگ و بو میں شرار مٹی کا بولتا ہے

نگار و حرف و نوا کی صورت خمار مٹی کا بولتا ہے

اِسی کی چاہت اِسی کی حسرت پروں سے لپٹی ہوئی ہے میرے

اُڑان بھرنے لگوں تو گرد و غبار مٹی کا بولتا ہے





محبتوں کو کہیں اور پال کر دیکھو
متاعِ جاں کو بدن سے نکال کر دیکھو

بدل کے دیکھو کبھی نسبتوں کی دنیا کو
بدن کو روح کے خانے میں ڈال کر دیکھو

سنو اسے تو سماعت سے ماورا ہو کر
جو دیکھنا ہو تو آنکھیں نکال کر دیکھو

یقین دشت سے پھوٹے گا آبجو کی طرح
کہ حرفِ 'لا' کی گواہی بحال کر دیکھو

نفس نفس ہے یہاں مقبرہ عقیدت کا
یہ مقبروں کا جہاں پائمال کر دیکھو

اسی ہوا میں محبت کا دیپ جلتا ہے
اِسی جہاں کو جہانِ وصال کر دیکھو

وہ سنگ دے تو حرارت نچوڑ لو اپنی
جو پھول دے تو نگاہِ کمال کر دیکھو

پھر اس کے بعد کوئی ڈر نہیں تلاطم کا
اس ایک بوند کے غم کو وِشال کر دیکھو

بدن کی پیاس بھی اک ماورا کہانی ہے
ہر ایک بوند کو دریا خیال کر دیکھو

پلٹ کے آئیں گے ساون کے رنگ آنکھوں میں
تم اپنے آپ سے رشتہ بحال کر دیکھو

وہ بولتا ہے پہاڑوں کی اوٹ سے اکثر
کسی پہاڑ سے اس کا سوال کر دیکھو

یہ راز اور کہاں تک ہمیں نبھانا ہے
کبھی تو رات میں سورج نکال کر دیکھو

تم اپنے گوہرِ یکتا کو اس طرح ڈھونڈو
کہ خود کو بے سر و ساماں خیال کر دیکھو

جو دیکھنا ہو کبھی دوستوں کا دل احمدؔ
کھرے اصول کا پتّا اُچھال کر دیکھو



ترے بتائے ہوئے نام لکھ رہا ہوں میں
وگرنہ رات بھی تیری چراغ بھی تیرا
سوال کس نے جگایا مری ضرورت کا
مرے دماغ کے اندر دماغ بھی تیرا



ایک نعتیہ غزل

لوگ اُس کا نام لیتے ہیں سیاست کے لیے
وہ کہ آیا لفظ و معنی کی شہادت کے لیے

ہم سرابوں کے لیے لڑتے ہیں مرتے ہیں یہاں
وہ سمندر پیاس والوں کی ضرورت کے لیے

آدمی کو مُکت کر ڈالا تھا اس نے خوف سے
مجھ کو دیکھو آج بھی زندہ ہوں دہشت کے لیے

فائدوں کا رُخ بدل کر رکھ دیا اُس نے یہاں
حوصلہ درکار ہے ایسی تجارت کے لیے

فکر کا سورج، خبر کا آسماں اُس نے دیا
اور آزادی بھی دی مجھ کو بغاوت کے لیے

میری سانسوں میں کہاں ہے ورنہ وہ خوشبوئے جاں
ساری تقریریں ہیں محفل کی حرارت کے لیے

حسن اس کا میرے آئینے میں کھلتا ہی نہیں
ذکر اس کا میرے ہونٹوں پر ہے برکت کے لیے

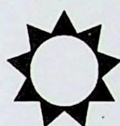
وہ بھی میرے ریگزاروں کے لیے ہے اجنبی
اجنبی ہوں میں بھی اس بارانِ رحمت کے لیے

اس کو انساں نے قبیلوں کے حوالے کر دیا
جو یہاں آیا تھا انسانوں کی وحدت کے لیے

درد کی فصلیں اُگاتا ہے وہ دل کے کھیت میں
اشک کے موتی لٹاتا ہے محبت کے لیے

نسبتوں کے بے ثمر جنگل میں سرگرداں ہوں میں
نام احمدؔ رکھ لیا حسنِ سماعت کے لیے





امروز کی کشتی کو ڈبونے کے لیے ہوں
کل اور کسی رنگ میں ہونے کے لیے ہوں

تو بھی ہے فقط اپنی شہادت کا طلبگار
میں بھی تو اسی درد میں رونے کے لیے ہوں

جینے کا تقاضا مجھے مرنے نہیں دیتا
مر کر بھی سمجھتا ہوں کہ ہونے کے لیے ہوں

ہاتھوں میں مرے چاند بھی لگتا ہے کھلونا
خوابوں میں فلک رنگ سمونے کے لیے ہوں

ہر بار یہ شیشے کا بدن ٹوٹ گیا ہے
ہر بار نئے ایک کھلونے کے لیے ہوں

پردیس کی راتوں میں بہت جاگ چکا میں
اب گھر کا سکوں اوڑھ کے سونے کے لیے ہوں

سینے میں کوئی زخم کہ کھلنے کے لیے ہے
آنکھوں میں کوئی اشک کہ رونے کے لیے ہوں

سادہ سی کوئی بات نہیں بھوک شکم کی
ایمان بھی روٹی میں سمونے کے لیے ہوں

وہ دشت و بیابان میں اظہار کا خواہاں
میں اپنے چمن زار میں رونے کے لیے ہوں

غاروں کا سفر ہے کہ مکمل نہیں ہوتا
میں اپنی خبر آپ ہی ڈھونے کے لیے ہوں

سورج کو نکلنے میں ذرا دیر ہے احمدؔ
پھر ذات کا ہر رنگ میں کھونے کے لیے ہوں



موت کا شیدا ہوں یا ماتم کا دِلدادہ ہوں میں
یا تعلق عشق کا رکھتا ہوں درگاہوں کے ساتھ
کیا خبر مجھ کو کتابوں میں ہے کیا لکھا ہوا
باندھ رکھا ہے مجھے مُلّا نے افواہوں کے ساتھ





یہاں ہر لفظ معنیٰ سے جُدا ہے
حقیقت زندگی سے ماورا ہے

ابھی چہرے کا خاکہ بن رہا ہے
ابھی کچھ اور بھی میرے سوا ہے

ہمیں جو کچھ ملا ناقص ملا ہے
مگر خوش فہمیوں کی انتہا ہے

کوئی چہرہ نہیں خوشبو کا لیکن
تماشہ پھول والوں کا لگا ہے

میں اس کی بارشوں کا منتظر ہوں
وہ مجھ سے میرے آنسو مانگتا ہوں

یہی باعث ہے میری تشنگی کا
سمندر مجھ سے پانی مانگتا ہے

جہالت روگ تھا جو دل کے اندر
وہی مذہب ہمارا ہو گیا ہے

مُقدّس ہو گیا ہے جھوٹ میرا
مجھے تو اب اسی کا آسرا ہے

میں پیاسا ہوں پرانے موسموں کا
مگر اب وہ زمانہ جا چکا ہے

کہانی برگِ سوزاں سے عبارت
وگرنہ بحر و بر بھی حاشیہ ہے

نہیں ہے خواب سی تصویر جس کی
تو پھر اس خواب کی تعبیر کیا ہے

گماں ہنگامہ آرائی کا عادی
یقیں تنہائیوں میں بولتا ہے

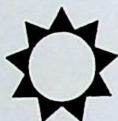
یہ دنیا بے خبر لوگوں کی احمدؔ
وہ دنیا کا نہیں جو جانتا ہے





واقعہ کچھ اور تھا پر تبصرہ کچھ اور ہے
کاروبارِ زندگی سارا برنگِ شور ہے
لفظ اب طاقت کا مظہر ہے عقیدت کا نہیں
بولیے کہ بولنے والا یہاں شہ زور ہے





سمایا ہے آنکھوں میں پانی کی صورت
مرے پاس ہے وہ نشانی کی صورت

کبھی تو وہ لفظوں کی بنجر زمیں تھا
کبھی کھِل گیا خوش بیانی کی صورت

وہ بارش کی بوچھار جیسا زمیں پر
پسِ امتحاں شادمانی کی صورت

میں نغموں کا چہرہ بدلنے کو ہوں اب
ہواؤں کی مانند پانی کی صورت

ہمیشہ سے محبوب ہے آدمی کو
سفر چوٹیوں کا جوانی کی صورت

سمیٹوں گا خود کو کسی داستاں میں
بکھر جاؤں گا پھر نشانی کی صورت

پگھل جائے گی برف سی جب لہو کی
تو میں چل پڑوں گا روانی کی صورت

میں اپنے ہی اظہار کا منتظر ہوں
کسی مژدۂ آسمانی کی صورت

زمانہ سمندر کی موجِ ہوا ہے
مکاں بھی ہے نقلِ مکانی کی صورت

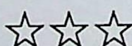
وہ میرے علاوہ مجھے چاہتا ہے
بڑی مختلف ہے کہانی کی صورت

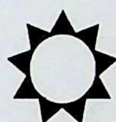
اداسی یہاں چاند کا استعارہ
تبسم ہے برگِ خزانی کی صورت

ابھی زندگی کی عبارت تھا احمدؔ
ابھی لکھ دیا آں جہانی کی صورت



اس وراثت کے حصہ داروں میں
کچھ تو عزت مآب ہوتے ہیں
اور جاہل، فقیر، درماندہ
وہ بھی اہلِ کتاب ہوتے ہیں





میرے بھی نادیدہ کتنے چہرے ہیں
تو نے بھی انسان چھپا کر رکھے ہیں

خوشبو کی حاجت بھی روٹی جیسی ہے
بھوک لگے تو لوگ مچلنے لگتے ہیں

دریا دریا اپنی پیاس کی خاطر ہم
لہروں کی تصویر بناتے رہتے ہیں

ہر ذرّے میں قدرت ہے شہ پاروں کی
ہر قطرے میں ساگر اوندھے رکھے ہیں

سورج کیا کیا رنگ دکھاتا رہتا ہے
کیا کیا منظر اس پردے کے پیچھے ہیں

اب نغموں کے دیپک کون جلائے گا
اب بنجارے پکے گھر میں رہتے ہیں

وہ بھی میری تاک میں چھپ کر بیٹھا ہے
میں نے بھی تاخیر کے حربے سیکھے ہیں

باہر انسانوں سے نفرت ہے لیکن
گھر میں ڈھیروں بچے پیدا کرتے ہیں

موسم سے اب میرا اتنا رشتہ ہے
کتنی دھوپ ہے کتنے بادل برسے ہیں

رشتوں کا آشوب انہیں کھا جائے گا
ہم سے کتنے دور ہمارے بچے ہیں

میں خود اپنے آپ سے ہوں بیگانہ سا
بستی کے انسان بھی میرے جیسے ہیں

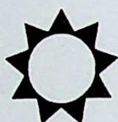
ان دیکھے موسم کی چرچا ہے احمدؔ
پیڑوں پر انجان پرندے بیٹھے ہیں





پانی پیا تو پیاس مری اور بڑھ گئی
چکھا تو اس زمین کا دانہ ہوس کا تھا
پھر اک سوال چاند ستاروں میں جل اُٹھا
میں منکشف ہوا تھا زمانہ ہوس کا تھا





ہے واہموں کا تماشہ یہاں وہاں دیکھو
ہمارے پاس مکمل خدا کہاں دیکھو

دل و دماغ کے اندر انا کی گونج سُنو
بلا سی کوئی لہو میں رواں دواں دیکھو

نفس کا سانپ کہاں زیر ہونے والا ہے
پھر اِس کے بعد کوئی اور امتحاں دیکھو

اب اپنے گھر کے لیے اک نئی زمیں سوچو
زمیں کے سر پہ کوئی تازہ آسماں دیکھو

اس اک سوال کے کتنے عذاب جھیل چکا
کچھ اور درد بُنو اور امتحاں دیکھو

گزر کے جانا ہے وحشت کے ایک دریا سے
یقیں نہ ہو تو یہاں راستہ کہاں دیکھو

کہاں سے آئے گی اب روشنی محبت کی
بہت دھواں ہے مکانوں کے درمیاں دیکھو

میں بے یقین ہوں ایسا کہ میرے ہاتھوں میں
تمام آئتیں سورج کی رائیگاں دیکھو

پھٹا ہوا کسی عریاں سوال جیسا ہے
ہمارے سر پہ یہ رحمت کا سائباں دیکھو

نشان ریت کے آئے ہیں میرے حصے میں
نکل گیا ہے بہت دور کارواں دیکھو

مسیح موت کا پیغام لے کے آیا ہے
اب اور کون بچائے گا میری جاں دیکھو

مرے حروف ادھوری اڑان جیسے ہیں
مرا شعور معانی کا آسماں دیکھو

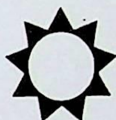
وہ ایک لمحہ حیات آشنا لکھو احمؔد
وگرنہ ساری کہانی ہی رائیگاں دیکھو





بس اک سکوت میں تحلیل ہو گیا آخر
وہ لفظ لفظ تراشا تھا جو انا کیلیۓ
بدن بھی ٹوٹ گیا نسبتیں بھی چھوٹ گئیں
میں اپنے آپ مکمل ہوا خدا کیلیۓ





زندگی کا ہر حسیں منظر خیالی ہو گیا
آئینہ بھی خوش نما چہروں سے خالی ہو گیا

اس نے پورے چاند کی صورت تراشا تھا مجھے
میں سیہ راتوں میں کرنوں کا سوالی ہو گیا

یہ سفر کی آخری منزل ہے پانی کے بغیر
ایک چشمہ تھا پسِ دیدہ کہ خالی ہوگیا

آیتوں کے بیچ اس نے رکھ دیے کتنے سوال
ساعتِ اظہار میں وہ بھی خیالی ہو گیا

کیا خبر کتنے جہانوں سے گزرنا ہے مجھے
اِس جہاں میں میرا ہونا احتمالی ہو گیا

کوئی رانجھا تھا حقیقت میں نہ کوئی ہیر تھی
سارا قصّہ ہی محبت کا خیالی ہو گیا

نوجوانوں کا قبیلہ اُس کے پیچھے چل پڑا
جرم کر کے بھاگنے والا مثالی ہو گیا

ایک بچّہ ذہن سے پیسہ کمانے کی مشین
دوسرا کمزور تھا سو یرغمالی ہو گیا

حسن اُس کا آشکارا ہو گیا احمد شناس
درد میرا پتہ پتہ ڈالی ہو گیا





وہ انکشاف کی صورت بدلتا رہتا ہے
ہوا میں ایک تو پانی میں دوسری تِتلی
کھِلیں گے اور بھی حیرت کے پھول گلشن میں
ابھی تو چاند سے اُترے گی اک نئی تِتلی



ہمارے بچے

(کشمیر کے مخصوص حالات کے پس منظر میں)

خداوندا وہ خوشبو کے امانت دار بچے
چمن سے منحرف ہیں پھول سے بیزار بچے

خزاں دیدہ گلابوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں
کتابوں کی حفاظت میں تھے جو پُر کار بچے

وہ کونپل پھوٹنے والی تھی جس سے بوئے اِقرا
اُسی کونپل سے آخر ہو گئے انکار بچے

سکولوں کے در و دیوار مرجھائے ہوئے ہیں
نہ جانے کیا ہوئے وہ لفظ کا پندار بچے

کسی نے پھر انہیں لوٹا دیا وحشت کی جانب
ہمیشہ مارنے مرنے کو ہیں تیار بچے

فرشتوں کی سماعت کے رسیلے بول والے
ملیں گے اب کہاں وہ زندگی کا پیار بچے

ملا ہے پرورش میں لفظ کا آشوب ان کو
سیاست کے لیے اچھے ہیں یہ بیمار بچے

سرابوں کے لیے اپنا گلستاں پھونکتے ہیں
امانی داستانوں کے امانت دار بچے

دعا کی روشنی آنکھوں میں نہ رشتوں کی شبنم
کہ پھولوں کی جگہ ہیں سنگ کی بوچھار بچے

وراثت میں ملی ہے پیاس اندھی نفرتوں کی
رگوں میں پالتے ہیں زہر کا انگار بچے

مکمل رہنمائی کا صحیفہ جیب میں ہے
مگر اندھے سفر میں مضمحل، لاچار بچے

ہمارے عہد کے آتش کدوں کی زندگی ہیں
یہ کچی عمر کے معصوم، لالہ زار بچے

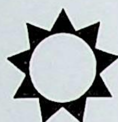
وہ موسم ہے کہ بنجر ہو گئے خوشبو کے سوتے
نہ غم پھولوں کا احمدؔ نہ کہیں غمخوار بچے





کبھی پہاڑ کے اوپر کبھی سمندر میں
میں بوند بوند تڑپتا ہوا بقا کیلئے
شگاف جان کے رکھا ہے میں نے کشتی میں
شکست میری ضرورت ہے ابتدا کیلئے





یہ وقفہ روشنی کا مختصر ہے
ابھی سورج طلوعِ منتظر ہے

شہادت لفظ کی دشوار تر ہے
کتابوں میں بہت زیر و زبر ہے

ابھی کھلنے کو ہے در آسماں کا
ابھی اظہار کا پیاسا بشر ہے

یہ دنیا ایک لمحے کا تماشہ
نہ جانے دوسرا لمحہ کدھر ہے

جو دیکھا ہے وہ سب کچھ ہے ہمارا
جو ان دیکھا ہے وہ امید بھر ہے

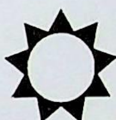
میں خود خاشاک گرویدہ ہوں ورنہ
مرے ہاتھوں میں تنکا شاہ پر ہے

پھر اس کے بعد بس حیرانیاں ہیں
خبر والا بھی خاصا بے خبر ہے

مرا نعرہ ہے جنگل آگ جیسا
مرا کلمہ شکستہ بال و پر ہے

زباں میری سیاست چاٹتی ہے
کہ اس کا ذائقہ شیر و شکر ہے

یہ اندھی پیاس کا موسم ہے احمدؔ
سمندر روشنی کا بے اثر ہے



بس اِک جہانِ تحیّر سے آنے والا ہے
وہ اجنبی مجھے اپنا بنانے والا ہے

گلاب سنگ کی صورت دکھانے والا ہے
کہاں، کہاں وہ مجھے آزمانے والا ہے

کوئی تو دیکھنے والا ہے میری آنکھوں سے
کوئی تو ہے جو تماشہ دِکھانے والا ہے

یہ چاند اور ستارے تو اک بہانہ ہیں
کچھ اور ہے جو یہاں جگمگانے والا ہے

ہر ایک جسم یہاں روح کی علامت ہے
یہ ریگزار بھی نغمہ سنانے والا ہے

بس اک سوال کی تخلیق ہے بشر جیسے
کہاں سے آیا ہے، کس اور جانے والا ہے؟

اُسے خبر ہے کہاں روشنی کا ماخذ ہے
وہ تیرگی میں دلوں کو جلانے والا ہے

امیر اس کی امانت اٹھا نہیں سکتا
فقیر اصل میں اس کا خزانے والا ہے

وہ ایک پیاس کا لمحہ جو میرے اندر ہے
کبھی کبھی تو سمندر لٹانے والا ہے

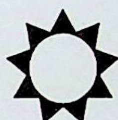
وہ خاکسار کو دیتا ہے پھول حصّے میں
وہ سنگزار میں دریا بہانے والا ہے

بہت عزیز ہے زیر و زبر کا کھیل اُسے
بجھا بجھا کے تمنا جگانے والا ہے

وہ ایک گوہرِ یکتا ہے میرے ساگر میں
وہ ایک اشک کہ آنکھوں میں آنے والا ہے

ثمر کو باندھ کے رکھتا ہے وہ درختوں پر
جو پک گیا اُسے نیچے گرانے والا ہے

وہ اپنے آپ ہی گھر لوٹ آئے گا احمد
کِسی کو کون ہمیشہ بُلانے والا ہے



تیرے ساز کا تانا بانا گورکھ دھندا
اور میری آواز میں گانا گورکھ دھندا

خواب کی صورت دنیا میرے ہاتھ نہ آئی
ہار گیا میں ایک سہانا گورکھ دھندا

میری لفظ شماری اُس کی حمد نہیں ہے
مالاؤں کا دانہ دانہ گورکھ دھندا

باہر سرسوں کھیت میں تتلی ایک پہیلی
اندر بھی ہے اک پروانہ گورکھ دھندا

دن بھر پیٹ کی خاطر لمبی دوڑ لگانا
رات کو آخر اوڑھ کے سونا گورکھ دھندا

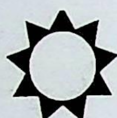
آیت کے ماتھے پہ مبہم حرف سجانا
اور شہادت میں الجھانا گورکھ دھندا

جس کے دل میں چاہے اپنی بات بٹھا دے
ناسمجھی بھی ایک بہانہ گورکھ دھندا

پہلے خود ہی ایک ادھوری خبر سنانا
پھر مجھ کو بے خبر بتانا گورکھ دھندا

چاند، چکوری، جگنو، دیپک اور پتنگا
رات کو جلنا اور جلانا گورکھ دھندا

جیون بھی ہے اپنا احمدؔ بھول بھلیاں
مر کر بھی یہ بوجھ اٹھانا گورکھ دھندا



آنے والے کسی لمحے کا نمائندہ ہوں
خواب بیدار ہوں احساس درخشندہ ہوں

پھول باہر ہے کہ اندر ہے میرے سینے میں
چاند روشن ہے کہ میں آپ ہی تابندہ ہوں

میں کہاں سطحِ زمیں پر ہوں نمایاں سارا
برگِ خوشبو کے سِوا جو ہوں وہ آئندہ ہوں

اپنے چھونے سے جگا ذات کی خوشبو مجھ میں
تو سنوارے گا مجھے ورنہ پراگندہ ہوں

اک ستارہ ہے کہ گم گشتۂ ظلمت جیسے
حرفِ اظہار خدایا کہ تیرا بندہ ہوں

اس سے پہلے کہ میں خاشاکِ ہوا ہو جاؤں
تیری سرحد میں اُتر جاؤں تو پائندہ ہوں

جسم بھوکا ہے تو ہے روح بھی پیاسی میری
کام ایسا ہے کہ دن رات کا کارندہ ہوں

روشنی ہے کہ ابھی تک نہیں اتری دل میں
روزِ اوّل سے کتابوں کا نمائندہ ہوں

نام اپنا کسی دیوار پہ لکھ کر احمؔد
میں سمجھتا ہوں ہمیشہ کے لیے کندّہ ہوں



دسمبر 2010

(حج کے دوران لکھے گئے اشعار)

اپنی حاجت اور طلب سے ناواقف ہوں
میں تو اب بھی زندہ ربّ سے ناواقف ہوں

اب بھی شجر و حجر ہیں میری آس کا ایندھن
دل کی دھڑکن اور سبب سے ناواقف ہوں

اب بھی میری قسمت سنگ وخشت کے تابع
اب بھی قدرت والے رّب سے ناواقف ہوں

حاضر ہوں میں کفن کی چادر اوڑھ کے لیکن
اب بھی مرگِ دادطلب سے ناواقف ہوں

لاشرکت، لبیک کا کلمہ ہونٹوں پر ہے
لفظوں کے مفہوم، ادب سے ناواقف ہوں

اب بھی باہر چاند، ستارے ڈھونڈھ رہا ہوں
اب بھی ذات کے تاب وتب سے ناواقف ہوں

دیواروں کا سایہ اوڑھ کے سونے والا
میں تو نیل گگن کی شب سے ناواقف ہوں

اس کی آیت میری قبر کا کتبہ جیسے
میں اس کے اظہارِ غضب سے ناواقف ہوں

اللہ والا ایک قبیلہ میری نسبت
اور میں اپنے نام، نسب سے نا واقف ہوں

میں ہوں احمدؔ مُردہ رسمیں ڈھونے والا
زندہ روح کے تاب وتب سے ناواقف ہوں

حضرت ابراهیم علیہ السلام
کی
وادیٔ غیرِ ذی ذرع کے نام

ان خرابوں سے فلک پاروں کی خوشبو آئے گی
واقعہ ایسا کہ افسانوں کی خوشبو آئے گی

ساربانوں کا قبیلہ رازداں ہو جائے گا
وادیٔ بے نام سے لفظوں کی خوشبو آئے گی

اپنے بندوں کو زمینوں سے جدا رکھتا ہے وہ
کیا خبر کس دشت سے پھولوں کی خوشبو آئے گی

چلچلاتی دھوپ کے سینے میں گہرے راز ہیں
جسم پگھلیں گے تو انسانوں کی خوشبو آئے گی

غار کے اندر سے بولے گی شہادت ذات کی
بے زبانوں سے اذاں والوں کی خوشبو آئے گی

اک خُدائے مُنتہا ہے خاکساروں کا خُدا
اب بیابانوں سے فرزانوں کی خوشبو آئے گی

ایک پل اظہار کا صدیوں پہ بھاری ہو گیا
اب شہنشاہوں سے بنجاروں کی خوشبو آئے گی

بیت جاتی ہے وگرنہ عمر ساری نیند میں
رات زندہ ہے تو پروانوں کی خوشبو آئے گی

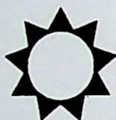
وہ شبِ اظہار جانے کس زمیں پر آئے گا
کس زمیں سے چاند کی، تاروں کی خوشبو آئے گی

پھر کہاں زندہ فقیروں کا زمانہ آئے گا
پھر کہاں تاریخ سے شاہوں کی خوشبو آئے گی

پھر نہ لکھے جائیں گے وہ لوگ ۔ جن کے نام سے
دوسری دنیا کے انسانوں کی خوشبو آئے گی

پھر نہ جسم و جاں فقیرانہ محبت سے ملے
پھر نہ احمدؔ اُن ملاقاتوں کی خوشبو آئے گی





میں بھی غار کے اندر جا کے دیپ جلانا بھول گیا
وہ بھی درد کا قصّہ اس کے بعد سنانا بھول گیا

میں نے بھی اب چڑیوں کی آوازیں سُننا چھوڑ دیا
وہ بھی میرے دل میں سچا گیت اُگانا بھول گیا

جب سے میں نے نیل گگن کی راتوں کا انکار کیا
گھر کی چھت پہ جانا کھُل کر نیر بہانا بھول گیا

وہ بھی اپنے لفظ کی خاطر اب میرا محتاج نہیں
میں بھی اپنے ہاتھ سے لکھنا اور لکھانا بھول گیا

ہم دونوں کے بیچ تعلق آنکھ میں آنسو جیسا تھا
پھر کیوں وہ برسات کے آگے بات بڑھانا بھول گیا

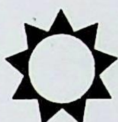
اس دنیا نے مجھ سے میرے سندر سپنے چھین لیے
پھول سے ملنا جلنا، چاند سے باتیں کرنا بھول گیا

میں نے بھی بچوں کو اپنی نسبت سے آزاد کیا
وہ بھی اپنے ہاتھوں سے انسان بنانا بھول گیا

میرے آگے پیچھے سوکھے پیڑوں کا اک جنگل ہے
میں اپنے خاشاک کو جیسے آگ دکھانا بھول گیا

نگل گیا پھر رات کا گہرا سایہ ہر پرچھائیں کو
کتنے دن تھا جسم کا اپنا ایک زمانہ بھول گیا

پیٹ کی خاطر مشرق سے مغرب کی دوڑ لگاتا ہوں
ایسی بھوک لگی ہے احمدؔ روٹی کھانا بھول گیا



تصّور کو جگا رکھا ہے اُس نے
دریچہ نیم وا رکھا ہے اُس نے

ذرا سا پھول میرے باغ میں ہے
بہت کچھ ماورا رکھا ہے اُس نے

بنا دیکھے گواہی مانگتا ہے
سوال اپنا جُدا رکھا ہے اُس نے

مرے ہونے سے خود میرا تعلق
برنگِ انتہا رکھا ہے اُس نے

مٹا دیتا ہے ہر تصویر میری
مجھے اپنا بنا رکھا ہے اُس نے

ہماری پیاس قطروں میں لکھی ہے
مگر دریا بہا رکھا ہے اُس نے

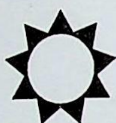
یہ سورج، چاند، تاروں کا زمانہ
بس اک لمحہ جلا رکھا ہے اُس نے

بناوٹ برملا پھولوں کی صورت
کہ خوشبو کو چھپا رکھا ہے اُس نے

کھڑی ہے راہ روکے خود فریبی
مجھے واپس بلا رکھا ہے اُس نے

ہوا کا ہے نہ پانی کا کرشمہ
نفس کو خود جلا رکھا ہے اُس نے

مجھے بے نام کر دیتا ہے احمدؔ
کہ نام اپنا خدا رکھا ہے اُس نے



تنہا جینے مرنے والا
رشتوں کا دم بھرنے والا

اپنا گھر بھی ہار گیا ہے
درد کی راہیں چلنے والا

اس کا سارا درد محبت
اور میں نفرت کرنے والا

ریت کی چادر اوڑھ کے سویا
دریاؤں پر چلنے والا

کچھ تو ہے جو ٹال رہا ہے
شام، سویرا کرنے والا

کس کا موتی سیپ کے اندر
کون حفاظت کرنے والا

بس اس کی پہچان یہی ہے
آنکھ میں آنسو بھرنے والا

عمر کی فصلیں کاٹ رہا ہے
لمحہ لمحہ مرنے والا

بے چہرہ تصویر ہے اُس کی
ہر تصویر پہ مرنے والا

سچ خاموشی کا رکھوالا
جھوٹ تماشہ کرنے والا

دنیا سے بے خوف ہے احمدؔ
اپنے آپ سے ڈرنے والا



اس دہرِ اضطرار کی صبحِ نمود میں

دیکھا تو ہر زبان پہ گانا ہوس کا تھا

تِتلی نگارِ خواب کی صورت سجی ہوئی

پھُولوں کے انکشاف میں دانہ ہوس کا تھا



اس صدی کی بے مثال مذہبی بصیرت کا انسان

مولانا وحید الدین خاں

حیات پوری کا آئینہ ہے شعور تیرا
کتاب کی اوّلیں دعا ہے شعور تیرا

تو نوعِ آدم کو ایک وحدت سے جوڑتا ہے
خدا سے انساں کا رابطہ ہے شعور تیرا

تو لفظ کی سرحدوں سے آگے نکل گیا ہے
کہ حسنِ معنی سے کھِل رہا ہے شعور تیرا

تری عبارت نئے زمانے کی آگہی ہے
کہ 'الرسالہ' میں بولتا ہے شعور تیرا

ہمیں دکھاتا ہے دُھند کے اس طرف کا منظر
طلوعِ ایماں کا واقعہ ہے شعور تیرا

رسولِ رحمت کا درد تیرے وجود میں ہے
ہمارا آگے کا مرحلہ ہے شعور تیرا

تِری محبت کا حُسن غیروں کی خیر خواہی
سلام رنگوں کا مجموعہ ہے شعور تیرا

تِری نظر میں نئے جزیرے ہیں زندگی کے
امید جیسا کھِلا ہوا ہے شعور تیرا

جمود ذہنوں کا اشک بن کے پگھل رہا ہے
گداز لمحوں کا ارتقا ہے شعور تیرا

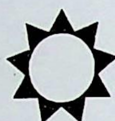
تو فکر کے نت نئے خزانے لٹا رہا ہے
کہ حرفِ تازہ کا سلسلہ ہے شعور تیرا

ہمیں سیاسی نصاب دیں کا عزیز تر ہے
پر اس کی تعبیر جانتا ہے شعور تیرا

رُکے ہوئے قافلے کی تحریک بن گیا ہے
کہ حق کی دعوت کا واقعہ ہے شعور تیرا

ابھی تو ذہنِ رسا کو درکار ہے زمانہ
ابھی زمانے سے ماورا ہے شعور تیرا

یہ فکر کل کی امید بن کے کھِلے گا احمدؔ
کہ آج کی فہم سے بڑا ہے شعور تیرا



اُمڈ کر آنے والی یہ گھٹائیں بھی قیامت
زمینوں سے محبت کی ادائیں بھی قیامت

ہمارے سر پہ ہے اک آسماں درویش سیرت
برنگِ برف دیتا ہے دعائیں بھی قیامت

اُڑانوں میں لُٹائیں آسمانوں کی اُمنگیں
پرندے زندگی کا گیت گائیں بھی قیامت

نفس کے موسموں کا رنگ تیکھا ہے زمیں پر
ہنسائیں بھی قیامت یہ رُلائیں بھی قیامت

یہاں جو شکل بھی ابھرے وہ آخر ڈوب جائے
کہ اس دریا میں موجیں آئیں جائیں بھی قیامت

بغیرِ جسم بھی ہے جسم کا احساس زندہ
یہ خوشبو بانٹنے والی ہوائیں بھی قیامت

حویلی کے لیے رونق کی شامیں ہیں مقرر
وہ ہنگامہ اور اس کی سائیں سائیں بھی قیامت

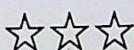
اُدھر سورج نکلنے کا تماشہ دیکھنے کا
اِدھر آنکھوں سے وابستہ شعائیں بھی قیامت

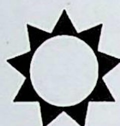
تمنا آسماں در آسماں لکھی ہے اس نے
وہ ان دیکھی ہزاروں کہکشائیں بھی قیامت

مگر چہروں کو کیا ملتا ہے تنہائی میں احمدؔ
کہ درپن میں اتر کر مسکرائیں بھی قیامت



ہوں خدا رنگ خدا سے میری نسبت دیکھو
نام لینا ہو جو اس کا تو وسیلہ مانگوں
درد کے ساتھ ملا ہے مجھے مذہب کا شعور
اپنے ریوڑ کے لئے ربِ قبیلہ مانگوں





پھیل رہے ہیں گہرے سائے کیا کیا
رات نہ جانے اور دکھائے کیا کیا

ننھے منے جگنو گھر میں رکھنا
ورنہ سورج بھی پچھتائے کیا کیا

پتھر کو سونگھو تو خوشبو آئے
پھولوں کی صورت مرجھائے کیا کیا

خود اس نے لکھا ہے لفظ ادھورا
میرے ہاتھوں سے لکھوائے کیا کیا

میں اُس کی پہچان ہوں یا وہ میری
کیا سمجھوں اور وہ سمجھائے کیا کیا

اندر ہے ہر چیز پگھلنے والی
آنسو بن کر آنکھ میں آئے کیا کیا

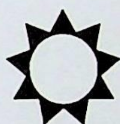
کیا کچھ میری آنکھ سے اوجھل رکھے
پردہ کھینچے اور دکھائے کیا کیا

میں خوابوں کے محل بنانے والا
وہ میری دیوار گرائے کیا کیا

فرزانوں کا نشہ ہے دنیا، دیکھو
حیرت کے ساغر چھلکائے کیا کیا

جاں لیوا اک جست کی خاطر دیکھو
اڑنے کی آواز لگائے کیا کیا

ہر موسم ہے پیاس کا موسم احمدؔ
پت جھڑ، ساون آگ لگائے کیا کیا



کن سرابوں سے گزارا تھا مجھے
حرفِ اظہار نے مارا تھا مجھے

شعر میرا بھی تھا آیت اس کی
لفظ بے نام ستارہ تھا مجھے

خود کو پایا تھا نہ کھویا میں نے
بیکراں ذات کنارا تھا مجھے

لے اڑی آج خد و خال ہوا
کل محبت سے بہارا تھا مجھے

سات قُلزم ہیں میرے سینے میں
ایک قطرے سے ابھارا تھا مجھے

خاک تھا جسم کہ انگارہ تھا
کس کے اندر سے گزارا تھا مجھے

بس تری لے تھی میرے نغموں میں
بس ترے درد کا یارا تھا مجھے

ظاہراً جرم پہ پابندی تھی
اور اندر سے اشارہ تھا مجھے

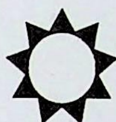
آج بھی لمحۂ موجود ہوں میں
کب زمانے نے گزارا تھا مجھے

میں نے ظاہر میں کسے دیکھا تھا
میری آنکھوں نے پکارا تھا مجھے

میں نے خود جسم تراشا اپنا
اس نے جنگل میں اتارا تھا مجھے

پیاس اس کی تو بدن میرا تھا
رنگ اس کا تو سنوارا تھا مجھے

دو دنوں کی مری گنتی احمدؔ
دو جہانوں میں شمارا تھا مجھے



اِس سفر کی آخری منزل گماں
پیڑ پر چھائیں سے چھوٹا ہے یہاں

کس نے رکھا ہے ہمارے درمیاں
ایک سورج اور خوابوں کا دھواں

خار و خس ہیں کوہساروں کی طرح
جسم میری روح کا بارِ گراں

سارا افسانہ شبِ اظہار کا
ایک لمحے کی تلاطم خیزیاں

ہے کڑا موسم پرندوں کے لیے
گھونسلوں کا غم نفس کی بجلیاں

کوئی لمحہ بھی فراغت کا نہیں
نیند بھی فصلیں اگاتی ہے یہاں

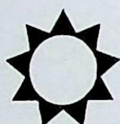
رفتہ رفتہ لفظ گونگے ہو گئے
اور گہری ہو گئیں خاموشیاں

رنگ سارے دیکھئے سنسار کے
جھیلئے اولاد کی بیزاریاں

یہ مکاں کہ دیکھنے میں بند ہے
کھولئے تو ہیں ہزاروں کھڑکیاں

یہ کہانی ختم ہونے کی نہیں
اس نے لکھا ہے جہاں اندر جہاں

رات بھر احمدؔ سرابوں کا سفر
صبح پھر تیار میری کشتیاں



تتلیوں کے لمس کی موجِ ہوا ہے
اس جہاں میں اور میرے پاس کیا ہے

بس یہی قصہ فروغِ جسم کا ہے
پیڑ کی چوٹی سے پتہ ٹوٹتا ہے

دیکھنا سننا بھی اک دیوار سا ہے
اُس طرف کوئی خزانہ خواب کا ہے

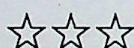
پر شکستہ ہے پرندہ اس سفر میں
اور سایہ ہے کہ اڑتا جا رہا ہے

آسماں چہرہ بدلنے کو ہے شائد
موسموں نے راز افشا کر دیا ہے

وہ خدا کے واسطے بولا ہمیشہ
اس لیے مذہب سے خارج ہو گیا ہے

وہ اذانِ ذات کا اللہُ اکبر
اب کسی مسجد کا چھوٹا سا خدا ہے

بجھ گیا آخر یدِ بیضا بھی احمدؔ
روشنی والا بھی مجھ سے کھیلتا ہے



جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کی فرمائش پر
فیض احمد فیض کے طرح مصرع پر لکھی گئی غزل
(کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا)

شب و روز نخلِ وجود کو نیا ایک برگِ انا دیا
ہمیں انحراف کا حوصلہ بھی دیا تو مثلِ دعا دیا

یہ سُبک پروں کی اڑان ہے یہ مسافتیں ہیں زوال کی
یہاں زندگی نے اسی لیے جو دیا برنگِ ہوا دیا

وہ طلوعِ حرف کی صبح اب کسی اور دشت کا خواب ہے
جو کھلا تھا میری زمین میں وہ پیام میں نے بھلا دیا

کئی موسموں سے ہوں منتظر سرِ شاخ اُس کے نزول کا
وہ جو طائرِ ہم صفیر تھا میری بے رخی نے اُڑا دیا

میں جو رو دیا ہوں تو کہکشاں کا سما ہے دل کے نواح میں
تہِ آب جیسے شکست نے نئے آسماں کا پتہ دیا

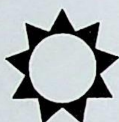
مجھے کیا خبر کہ ثبات کی یہ علامتیں ہیں کہاں کہاں
کہ جو نیند آئی تو خواب نے مجھے آسماں پہ جگا دیا

نہ سماعتوں میں وہ روشنی نہ بصارتوں میں شعور ہے
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

وہ کتاب دائم اتر رہی ہے ہر ایک دل پہ ذرا ذرا
کبھی شعر میں نے رقم کیا کبھی گیت تو نے سنا دیا

نئی آرزو کو تراشنے کا ہُنر کہاں تھا بہشت میں
مجھے اختراع کی پیاس دی تو جہاں بھی اس نے نیا دیا

یہ جہانِ لطف ونظر بھی احمد شناسؔ حسبِ سوال ہے
کبھی صبحِ رغبت نے میرے دستِ دعا پہ سورج اگا دیا



ترے قلم نے فقط ایک نام لکھا تھا
مرے بیاں نے مجھے ناتمام لکھا تھا

میں اکتشاف کی ہجرت بہشت سے لایا
مری تلاش میں میرا مقام لکھا تھا

اُٹھالیا تھا مجھے کُن فکاں نے ساحل سے
پھر اس کے بعد ہنر کا مقام لکھا تھا

غرورِ حسنِ نظر کے ہزار پردے تھے
بدل بدل کے ہوس کا پیام لکھا تھا

زمیں کے چشمۂ حیرت سے روشنائی لی
کہ میں نے شاخِ قمر سے کلام لکھا تھا

وہ صبحِ نور کا اظہار بن کے آئے گا
کہ جس کی ڈوبتی پلکوں پہ شام لکھا تھا

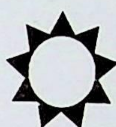
وہ آگ اوس کے قطروں سے بجھ گئی آخر
کہ جس کے نام سمندر تمام لکھا تھا

اُسی سے توڑ لیا ہم نے رابطہ اپنا
اُسی کے ساتھ ہمارا دوام لکھا تھا

ہر ایک سانس یہاں جسم کی مقیّد تھی
ہر ایک لمحہ رہائی کے نام لکھا تھا

میں اس لیے بھی مکمل نہ ہو سکا احمؔد
مرے خدا کو خداوندِ تام لکھا تھا





اس ہوا پانی کا سرچشمہ دُعا ہے
ہر نفس جینے کی خاطر مر رہا ہے

خون کی گردش میں شامل آبِ حیواں
میری شریانوں میں جنت کی ہوا ہے

اپنے اندر ہی نکل آیا ہے سورج
جسم اپنی دھوپ سے جاگا ہوا ہے

نیند میں کھِلتا ہے جو بچے کے رُخ پر
وہ تبسم راز داروں کی ادا ہے

تاک میں رہتی ہیں یخ بستہ ہوائیں
یہ شرر کب آسماں تک پہنچتا ہے

ساحلوں کے پھول مرجھائے ہوئے ہیں
منجمد جیسے سمندر کی ہوا ہے

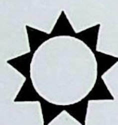
کھو گیا وہ اشتہاروں کے سفر میں
روز اخباروں میں خود کو ڈھونڈتا ہے

آشتی کا پیڑ تھا آنگن میں اُس کے
پھل جلا وطنی کا ٹہنی پر لگا ہے

رات کا غم ہے کہ میری دھڑکنوں میں
کوئی انجانا سویرا جل رہا ہے

خود گواہی کو یہاں مصلوب دیکھا
یہ خداؤں کی عمارت بے خدا ہے

شہر یہ اللہ والوں کا ہے احمدؔ
ہر طرف انکارِ جاں لکھا ہوا ہے



اپنا وجود کھول کے دیکھا گماں کی رات
باغِ بہشت چھوڑ دیا کُن فکاں کی رات

جب تک لہو کی آگ سلگتی ہے جسم میں
آئے گی بار بار میرے امتحاں کی رات

کتنی مشقّتوں سے بجھائی شکم کی آگ
پھر سامنے کھڑی تھی حسیں کہکشاں کی رات

جگنو بھی ہم صفیر ستارا بھی ہم نوا
کھلتی ہے اک کتاب دبستانِ جاں کی رات

جسموں کے اکتشاف کا عرصہ دراز تھا
سورج کا ایک روز تھا باقی گماں کی رات

تشکیک پالتا ہے مکانوں میں آدمی
ورنہ شبِ یقیں ہے کھلے آسماں کی رات

اک اجنبی چراغ کی انجان روشنی
جلتی ہے ہر مکان میں جانے کہاں کی رات

احمد وہ ایک شہر[1] بھی ہے دیکھنے کی چیز
کھلتی جہاں ہے صبح سے پہلے اذاں کی رات

[1] اشارہ شہر مکہ کی طرف ہے۔





میری صورت میرے چہرے سے جُدا ہے
آئینہ بھی دیکھ کے حیرت زدہ ہے
میں نے کاندھوں پہ اٹھا رکھی ہے شورش
نام میرا السلاؔم و الدّعا ہے



کئی نظموں کی ایک نظم

ماں اور کتاب

(۱)

وہ خُدا

پردۂ غیب میں رہنے والا

جس نے آدم کو سکونت کے لیے

سو رنگ کے اظہارِ تعلق کی زمیں بخشی تھی

وہ خُدا

نعمتِ شیریں کا خُدا

شہد کی مکھی کو وحی رُخ پہ اُڑاتے ہوئے

پھولوں سے ملانے والا

وہ خُدا۔

صُبحدم

بزمِ شہادت کے پرندوں کو

جگانے والا

اور اذاں ذات کی

شہر و بیاباں میں سنانے والا

وہ خُدا۔

نظمِ اسباب میں باندھی ہوئی

دنیا کا خُدا

اپنی مخلوق میں

تخلیق کی قوت کا خُدا

ماں کے وسیلے کا خُدا

ماں کہ خالق کی طرح

آفرینش کے گلستاں میں

نئے پھُول اُگانے والی

شمعِ ہستی میں

لہو اپنا جلانے والی

غمگساری کا۔

فکرِ فردا کا سبق

نسلِ آدم کو

پڑھانے والی

روزِ اوّل سے کلام اُس کا تھا

الفاظ میں پوشیدہ معانی کی طرح

جب نہ جلتے تھے ابھی

ظلمت میں کتابوں کے چراغ

خود جلا کرتی تھی ماں

بچّوں کی بصیرت کے لئے

ایک کہانی کی طرح

پھر وہی ماں کی کہانی

اساطیر کی مانند

نسل در نسل

صحیفوں میں رقم ہوتی چلی آتی تھی

(۲)

آسمانِ فکر کا

یہ وہی سلسلۂ حرفِ وحی تھا

کہ میرے پاس ہے آج

ایک کتابِ فُرقان

میں نے جب کھول کے دیکھا اِس کو

تو یہ احساس ہوا تھا مجھ کو

کہ میں اسے جانتا ہوں، ویسے ہی

جیسے میں جانتا ہوں تجھ کو، ماں

تو بھی گھلتی ہے مرے غم میں

شمع صورت

یہ بھی جلتی ہے میرے واسطے

آیت آیت

اس کے لفظوں پہ مرے ہاتھ کی چلتی ہوئی انگلی جیسے

ہاتھ تھامے ہوئے میرا

رطب ویابس کی پر اِسرار

مسافت میں مرے ساتھ ہے تُو

میں وہ بچہ کہ بہل جاتا ہوں

ریت پہ کھینچی ہوئی تصویروں سے

تُو مجھے گوہرِ دریا کو پرکھنے کی

نظر دیتی ہے

تیری آگاہی سے، ماں

کھُلتی ہے کتاب

اور کھُلتے ہیں میری ذات

کے آثار ونشاں

(۳)

میں صحیفۂ قرآں کی

آیتِ 'صَلصال' سے تعبیر

کھنکھناتی ہوئی آواز کا اک پیکر تھا

میری آرائشِ باطن کے لیے

فکرِ لقماں کے کئی دشت کھنگالے تو نے

اور روشن کیے

ان گِنت

شب خیز دعاؤں کے چراغ

وہ تری

مریں مریں انگلیاں

جن میں دیکھا ہے فروزاں میں نے

گیلی مٹی کا ہُنر

تیری سانسوں کی تگ وتاز میں

سونگی میں نے

اپنی خوشبوئے وجود

اشک جو میرے لیے

تیری ممتا نے بہائے تھے کبھی

تابِ سبزہ میری آنکھوں میں اُسی نیر کا ہے

گھر کی تعمیر کہ تصویر میری

تیرے ہاتھوں کا کرشمہ ہے تمام

تو نے نمناک پہاڑوں سے کہیں

چُن کے لائی تھی میرے جسم کی مٹی جیسے

اور پھر درد کے پیار کے

سانچے میں مجھے ڈھالا تھا

(۴)

تیرے سائے کی طرح

روزِ اوّل سے ہے

ساتھ ہمارے جیسے

وحدتِ کل کی شہادت

نسلِ آدم کی قیادت یہ کتاب

ماں۔ تیرے جیسی ہے ہماری یہ کتاب

ہر جگہ ہر گھڑی ہر حال میں

جاری یہ کتاب

بات کرتی ہے تو لگتا ہے

کہ موجود ہے تُو

وہی تلقین کا لہجہ

وہی تکرار کی خُو

کبھی الفاظ میں پُرخوف گھٹاؤں کی کڑک

کبھی گفتار میں خوش رنگ گلابوں کی مہک

تیری آواز کی لوَ

آج بھی لرزاں ہے میرے کانوں میں

تیری سرگوشیاں

آسمانوں کی مناجات کی مانند

میرے چاروں طرف پھیلی ہیں

(۵)

سفرِ زیست پہ جب میں نکلا

تو نے رخصت کیا تھا مجھ کو

دیدہ و نادیدہ

جہانوں کے مسافر کی طرح

''میرے بچے

تو یہاں امرِ معین کی طرح زندہ ہے

تو کسی اور کا کارندہ ہے

وہ کہ خود حرف بھی معروف بھی ہے

اس کی معصوم تمنّا

کہ تیرے کشفِ بیاں سے

تیرے رمز و کنایہ سے وہ جانا جائے

رازاب بھی ہے وہی راز۔ میاں

صبحِ تخلیق سے اظہار کا تشنہ ہے جہاں

ایک سورج ہے نظر میں

تو ہزاروں ہیں نہاں

تیرے سینے میں ہے پیوست

سوالوں کی کسک

پیڑ چھوٹا ہے تو سایہ ہے

افق تا بہ افق

یہاں قطرے میں ہے دریا

تو ہمالہ ہے کسی رائی میں

کھا کے ٹھوکر نہ تو۔ گر جانا کہیں کھائی میں''

(٦)

''دیکھنا

تیرے رگ و پے میں طلوع ہوں گے

نئی دھوپ کے چاند

ایک دن

تیری سماعت پہ ابھر آئیں گے

تصویر کے خاموش سَرُود

دیکھنا

تیرا لہو

آگ کے پھولوں سے سجائے گا تجھے

چاند تاروں کے ہنڈولے میں

بٹھائے گا تجھے

آسمانوں میں

اُڑائے گا تجھے

جب امنگوں سے شرابور گھٹا چھائے گی

حُسن چہروں کا

دل و جان سے بھائے گا تجھے

پھر زلیخاؤں کی ہر سازش سے

تیرے اندر کا حیادار

وہ یوسف[1] ہی بچائے گا تجھے"

(۷)

جان رکھو کہ

---

[1] پیغمبرِ خُدا حضرتِ یوسف علیہ السلام

صداز ارِ بدن کی ہوس آرائیوں میں

اسمِ اعظم کی اذاں

ڈھونڈ رہی ہے تجھ کو

اشک بن کر

تیری آنکھوں سے ٹپکنے کے لیے

ساعتِ عمرِ رواں

ڈھونڈ رہی ہے تجھ کو

آسمانوں سے کوئی لفظ نہ اترے

پھر بھی

چاندراتوں کی

یہ دلدوز زباں ڈھونڈ رہی ہے تجھ کو

خودسر و بے خبر انسان کی اس دنیا میں

حیرتِ طورنشاں

ڈھونڈ رہی ہے تجھ کو"

(۸)

"اے میری جاں

مرے خواب نشاں

تیری آنکھوں میں ہے کیوں؟

ٹھٹھرے ہوئے موسم کا جمود

جیسے آزاد ہواؤں کا سفر

تیری سانسوں کی گزرگاہ میں کہیں

ٹوٹ کے رہ جاتا ہے

جیسے بے خوف شعاؤں کی سحر

دھول بن کے تیرے آنگن میں بکھر جاتی ہے

تونے پوچھا ہے کبھی خود سے
کیوں جگاتا نہیں
سبز آہنگ درختوں کا
تیرے سوئے ہوئے نغموں کو
کیوں رُلاتا نہیں؟
ابرِ نیساں کا کوئی لمحۂ بے باک تجھے
حبس جاں، حبس پریشاں سے
نکلنے کے لیے
کبھی موسیٰ[1] کی طرح
دستِ دعا تم بھی اُٹھا کر دیکھو

---

1 پیغمبرِ خُدا حضرت موسیٰ علیہ السلام

''ربی شرح لی صدری

یسّرِ لی امری............

عین ممکن ہے کہ

تیرے نہاں خانۂ جسم

ایک دریچہ کھل جائے

تیری شریانوں میں در آئے مہک

لالۂ صحرائی کی

تیرا آفاقِ نظر

مطلعٔ انوار بھی ہوسکتا ہے

وہ جو چاہے تو تیرے واسطے

بے یقینی کے اندھیروں میں

نیل دریا کی طرح

راستہ ہموار بھی ہو سکتا ہے"

(۹)

"میرے بچے

تجھے معلوم بھی ہے

کہ تیرا حسب ونسب

اُس براھیم[1] سے جا ملتا ہے

جو سفر ذات کا

دہکائی ہوئی آگ میں

خوشبو کی طرح کرتا ہے

جو کڑی دھوپ کے موسم میں

---

[1] یعنی پیغمبرِ خدا حضرت ابراھیم علیہ السلام

گلابوں کی طرح کھِلتا ہے

جس نے اولاد کی خاطر

من وسلویٰ کی نہیں

بھوک اور پیاس کے صحرا میں

تڑپنے کی دعا مانگی تھی

اُس نے دیکھا تھا

عُسر

نسلِ توانا کے لیے پردۂ رحمت کی طرح

اس کو معلوم تھا

اک روز

اُسی وادیٔ ناممکن سے

پھوٹنے والا ہے وہ

چشمۂ خیرِ کثیر

جس کی ہر بوند سمندر ہوگی

ہونٹ تر ہوں گے

تو سینے میں سماوات کے کھلنے کی بشارت ہوگی

اپنی پہچان میں وہ

فطرت کا جیالا۔ انساں

تا ابد تاب و تواں

ٹوٹنے دیتا نہیں

سانس کی ڈوری کو یہاں

اسمِ احمد کا امیں

ہاں وہی ایک کہ

دنیا کی خبر اور نظر والی

کتابوں نے لکھا تھا جس کو

''شمعِ اِقرا کی نئی جوت جلانے والا

فصلِ احدؔ کی نئی پود اُگانے والا''

تم اتر کر کبھی دیکھو تو سہی

ذات کی پنہائیوں میں

یہ چمکتا ہوا جگنو جو

ترے نخلِ شبستاں پہ نظر آتا ہے

وہ اُسی

مردِ خبردار کی راتوں کے

کسی لمحۂ بیدار کا حصہ ہوگا''

(۱۰)

ماں

تیری باتوں سے

میرے پیکر میں

جاگ اُٹھتا ہے سماعت کا ضمیر

جیسے آواز لگاتا ہے

پچھلے پہر

ہُو کے عالم میں فقیر

کہ خبردار رہو۔

اور سُنو۔

مالکِ کون ومکاں

آپ قسم کھاتا ہے

''فلا اُقسمہُ بالّشِفق
واَلیل و وماوسَق
و اَلقمر و اِذاتسق
لا ترکبّنَ طَبقاً عن طبق''
''جان رکھو کہ
یہ آرائشِ موجود کا طشت
ہے اُلٹنے کے لیے
آنے والی ہے وہ چیز
کھڑکھڑانے والی
اور ہوا
ارض وسما کی ہے
اکھڑنے والی

یہ توانائی کا سورج

یہ بلندی کے ستارے

یہ پہاڑ

اک دھماکے سے بکھر جائیں گے

خاشاک کی مانند

پراگندہ غُبار

حادثہ جب یہ گزر جائے گا

پھر خداوندِ حیات

ایک آواز سے

بکھرے ہوئے ذروں کو

اُسی نام کے پیکر میں جمع کر لے گا

وہی مطلوب بشر اُس کا مخاطب ہوگا

اور انصاف کی میزان کے ساتھ

بخشے ہوئے ایام کا مانگے گا حساب

حشر ساماں وہ اک روز

کہ جب

کوئی ماں ہوگی نہ باپ نہ بیٹا ہوگا

آج یہ جسم کے اعضا

جو تیرے اپنے ہیں

کل یہی تیرے مقابل میں کھڑے ہوں گے

حریفانہ گواہی لے کر"

(۱۱)

روح فرسا یہ خبر سن کے

میں اس سوچ میں ہوں



کہ سر برہنہ میں کدھر جاؤں گا؟

ماں

کیا تیرا سایۂ صد برگ

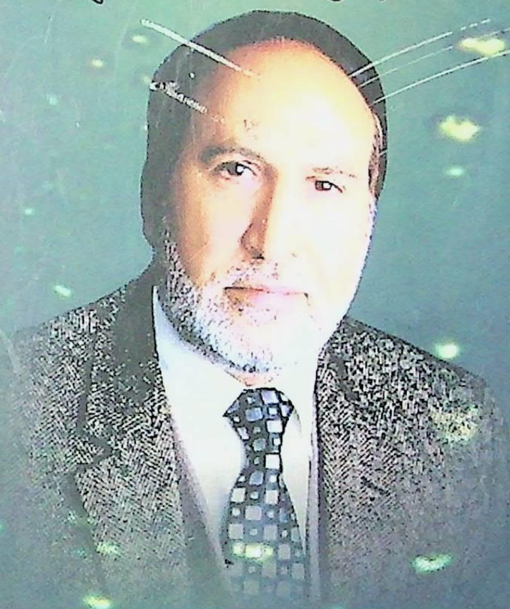
اس روز

میرے سر سے اُتر جائے گا؟

☆☆☆

SALSAL

(Poetry)



Ahmad Shanas



RAHBAR BOOK SERVICE
Printer, Publishers&Distributor
Post Box No: 9736, Jamia Nagar, New Delhi-110025(India)
Mobile: +91-9810862382,
E-mail:rahbarbookservice@gmail.com

